www.urducouncil.nic.in

قیمت : -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

فروری 2024

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِ تعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد:8 شمارہ:2 فروری 2024

مدیر اعلیٰ : پروفیسر دھننجے سنگھ

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: الیس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل — مدیر — 4

جہان نسواں

اکیسویں صدی کی نمائندہ خواتین افسانہ نگار- ایک جائزہ — پروفیسر شہاب الدین ثاقب — 5

'فوٹو گرافر' میں وقت کی حاکمیت کا بیانیہ — ڈاکٹر نصرت جبین — 11

جلتے پروں سے اڑان: ایک جائزہ — شکیلہ نگار — 16

آمنہ ابوالحسن کا افسانہ ''کاش'': تفہیم وتنقید — اویس احمد بھٹ — 19

غالب کا ہے انداز بیاں اور — فرزانہ پروین — 25

اردو اخبارات میں خواتین کا حصہ — سیدہ مریم الٰہی — 29

مسز عبدالقادر کی افسانوی دنیا — ڈاکٹر مدثر احمد گنائی — 32

ثروت خان کا ''اندھیرا پگ'' — ڈاکٹر جنتی جہاں — 38

برار کے افسانوی ادب کا ابھرتا فنکار: محمد علیم اسماعیل — نعیمہ خانم سراج خان — 41

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 45

افسانہ

زندگی دھوپ تم گھنا سایہ — ڈاکٹر فریدہ تبسم — 46

پین کلر — نازنین فردوس — 49

انتظار اب اور نہیں — صاحبہ فردوس — 54

حسن سخن

نازیہ افروز، کوثر پروین، نہاں رباب — 57

صحت

بال اور ناخن کے امراض — حکیم محمد اکبر — 59

قارئین کے خطوط

مراسلہ — 62

مشعل

زبان کو جذبات اور احساسات کو اظہار کا ذریعہ کہا گیا ہے۔ مادری زبان سے مراد وہ زبان ہے جو کسی ملک، خط، گروہ یا خاندان کے لوگوں کے ذریعے بولی جاتی ہے۔ اصطلاح میں مادری زبان سے مراد کسی شخص کی مادری زبان سے ہے۔ مادری زبان کا استعمال ہمارے گھروں سے ہی شروع ہوتا ہے۔ مادری زبان گھریلو زبان کے ذریعے ہی سیکھی جاتی ہے۔

اردو بھی ہماری مادری زبانوں میں سے ہے۔ یہ ہندوستان میں رابطے کی زبان بھی ہے اور ہندوستان کی کئی ریاستوں کی دفتری زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ اردو زبان کو کئی دوسرے ناموں سے بھی جانا جاتا ہے۔ مثلاً ہندوستانی، ہندوی، ریختہ، اور دکھنی وغیرہ۔ مادری زبان کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اس میں ہر موضوع پر بات ہوسکتی ہے۔ کلچر، تہذیب اور معاشرہ سب ہی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ماری زبان نسل در نسل منتقل ہوتی رہی ہے۔ زبان کے ساتھ انسان کا تعلق بہت گہرا ہوتا ہے۔ انسان اسے اپنے سماج کا بہترین اثاثہ سمجھتا ہے۔ زبان قوم کی تشکیل میں اہم رول ادا کرنے کے ساتھ ساتھ تہذیبی شعور بھی سکھاتی ہے۔

ماہرین اس بات پر مکمل اتفاق کرتے ہیں کہ بچہ اپنی مادری زبان میں بہترین طور پر تعلیم حاصل کرتا ہے۔ نئی قومی تعلیمی پالیسی میں بھی اس بات پر زور ہے کہ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ زبان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے پس منظر کو بھی ذہن میں رکھیں مثلاً زبانوں کی تنزلی کے کیا اسباب ہیں، زبانیں کس طرح عروج حاصل کرتی ہیں اور زبانوں کو کس طریقے سے معاشرے کے لوگوں کے ذریعے متعارف کرایا جاسکتا ہے۔ دنیا بھر میں اکیس فروری کو اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسکو (UNESCO) کی طرف سے عالمی یوم مادری زبان کے طور پر منایا جاتا ہے۔ مقصد اس کا یہی ہے کہ مادری زبان کے تئیں ہم مکمل طور پر بیدار رہیں۔

اردو زبان کسی بھی ملک کی زبان اور وہاں کے شعر و ادب سے کسی بھی طور پر کم نہیں ہے۔ اردو زبان نے ملک کی جدو جہد آزادی میں اہم رول ادا کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کا درس بھی دیا۔ سماجی ہم آہنگی میں بھی اس نے مثبت کردار ادا کیا۔ ملک کی گنگا جمنی تہذیب کے قیام، مشرقی تعلیم، صحافت، سنیما، ذرائع ابلاغ اور ملک کی ہمہ جہت ترقی میں اردو زبان کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ ہمیں بھی اپنی زبانوں کے تئیں سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔ زبان سے انسان کو جذباتی طور پر لگاؤ ہوتا ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم اپنی مادری زبان کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش کریں۔ اردو کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے تئیں سنجیدہ ہوں۔ حکومت بھی زبانوں کی ترقی کے لیے کوشاں ہے اور اس ضمن میں کئی اہم کام بھی کیے ہیں۔ ہمیں بھی اپنی مادری زبان سے محبت کرنی چاہیے اور اس کی ترقی کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔ اردو زبان کی ترقی کے لیے ہم سب کو اپنے اپنے طور پر کوشش کرنی چاہیے۔

آپ کا

پروفیسر دھننجے سنگھ

پروفیسر شہاب الدین ثاقب

اکیسویں صدی کی نمائندہ خواتین افسانہ نگار

ایک جائزہ

اردو فکشن کے ارتقا میں خواتین نے بہت متحرک اور فعال کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ اردو کا ابتدائی فکشن خواتین کے لیے ہی تخلیق کیا گیا۔ نذیر احمد کے ناول ''مرآۃ العروس'' (1869) اور ''بنات النعش'' (1872) لڑکیوں کی تربیت واصلاح کے مقصد سے لکھے گئے اور اردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری نے اولین افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' کے عنوان سے لکھا تھا جو رسالہ مخزن، لاہور، دسمبر 1903 میں شائع ہوا اور یہی افسانہ ان کے مجموعہ ''مسلی ہوئی پتیاں'' (عصمت بک ڈپو، دہلی 1937 میں ''بڑی بہن کا خط'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اسی طرح ان کا افسانہ ''نند اور بھاوج کا خط'' کے عنوان سے بھی ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو کا پہلا افسانہ بھی طبقۂ اناث کے لیے لکھا گیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد پھر یہ ہوا کہ خواتین نے خود ہی زمام قلم سنبھال لی اور فکشن کو نئی جہات سے روشناس کرایا۔ ابتدائی دور کی خواتین افسانہ نگاروں میں نذر الباقر (نذر سجاد حیدر، 1894-1967)، عباسی بیگم (مشہور افسانہ ''گرفتار قفس''-1915) اور حجاب امتیاز علی (1915-1999) کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ حجاب کا اولین افسانہ ''میری ناتمام محبت'' 1932 میں نیرنگ خیال (لاہور) میں شائع ہوا اور اسی سال ''انگارے'' کی اشاعت (دسمبر 1932) سے رشید جہاں کا نام بھی ایک چونکا دینے والی آواز کے طور پر سامنے آیا۔ ''انگارے'' میں رشید جہاں کا ایک افسانہ ''دلّی کی سیر'' اور ایک ڈراما ''پردے کے پیچھے'' شامل ہے۔ اس کے بعد رشید جہاں کے دو مجموعے ''عورت اور دیگر افسانے'' (مشمولہ چھ افسانے، ایک ڈراما، ہاشمی بک ڈپو، لاہور، نومبر 1937) اور ''شعلۂ جوالہ'' (گیارہ افسانے، ایک ڈراما، نامی پریس، لکھنؤ 1968) شائع ہوئے۔ خواتین کی افسانہ نگاری کے ارتقائی سلسلے میں عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، شکیلہ اختر، صدیقہ بیگم سیوہاروی، ممتاز شیریں، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، صالحہ عابد حسین وغیرہ جیسے اہم نام ابھر کر سامنے آئے جن کے فن کا مطالعہ اور جائزہ فی الوقت ہمارا موضوع نہیں ہے۔

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی اور اس کے بعد تک جو خواتین افسانہ نگار اپنے قلم کی جولانیاں دکھاتی رہیں ان میں اہم نام:

زاہدہ حنا، خالدہ حسین، بیگم جمال اختر، رضیہ فصیح احمد، انور نزہت، بانو سرتاج، قمر جمالی، قمر جہاں، تسنیم کوثر، تبسم فاطمہ، شائستہ فاخری، صبوحی طارق، فیروزہ جعفر، سلطانہ مہر، اشرف جہاں، شاہدہ یوسف، نشاط افزا، نکہت ریحانہ خاں، شمیم صادقہ، اختر بیگانہ، اختر جمال، افشاں عباسی، افضل توصیف، ام عمارہ، بشریٰ اعجاز، بشریٰ رحمٰن، ثریا جبیں، حمیدہ معین رضوی، خالدہ شفیع، رضیہ شمع، رفعت مرتضی، زینت قاضی، سائرہ ہاشمی، سعدیہ نسیم،

سیدہ حنا، سیما یاسمین مجتبیٰ، شکیلہ رفیق، شمع خالد، عذرا اصغر، فرخندہ لودھی، فردوس حیدر، قدسیہ انصاری، کہکشاں ملک، گلنار آفریں، محسنہ جیلانی، مسرت لغاری، نسرین قریشی، نیلم بشیر احمد، نگار عظیم، نسترن فتیحی، نسرین ترنم، مسرور جہاں، رضیہ حامد، شگفتہ عارف، صغریٰ مہدی، اعجاز شاہین، شمیم افزا قمر، ذکیہ مشہدی، عصمت آرا، شیریں نیازی، امتیاز فاطمی، صبوحی طارق، نشاط افزا، امروز جہاں، تسنیم کوثر، کہکشاں پروین، نسرین ترنم، نکہت پروین وغیرہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ فہرست طویل ہے۔ ان میں سے کچھ خواتین اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور کچھ نے طویل خاموشی اختیار کر رکھی ہے لیکن ان میں متعدد خواتین ایسی ہیں جن کا قلم آج بھی رواں دواں ہے۔

اکیسویں صدی کے دو عشروں کے دوران جن خواتین افسانہ نگاروں کے نام ہمارے سامنے ہیں ان میں:

جیلانی بانو، ذکیہ مشہدی، طاہرہ اقبال، شائستہ فاخری، نعیمہ جعفری پاشا، رخشندہ روحی مہدی، مبینہ امام، کہکشاں انجم، زینب نقوی، رینو بہل، نسرین ترنم، ثروت خاں، شہناز شاہین، بانو سرتاج، قمر جمالی، انور نزہت، نوشابہ خاتون، صبیحہ انور، شہناز رحمٰن، آشا پربھات، انجم قدوائی، فرزانہ اسلم، فرح جاوید، یاسمین اختر، افشاں ملک، خالدہ ناز، صادقہ نواب سحر، لالی چودھری، سلمیٰ جیلانی، عنبری رحمٰن، شہیرہ مسرور، شکیلہ بانو (ش۔بانو)، مہر افروز، نیلوفر پروین، ناہید طاہر، شیریں نیازی، رخسانہ نازنین، شبانہ پروین وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اس فہرست میں عین ممکن ہے کہ کچھ نام شامل ہونے سے رہ گئے ہوں۔ غزال ضیغم اور فاطمہ حسن بیسویں صدی کے اختتام پر اپنے افسانوی مجموعوں کے ساتھ نمودار ہوئی تھیں۔ اول الذکر کا مجموعہ ''کہانیاں گم ہو جاتی ہیں'' اور غزال ضیغم کا مجموعہ ''ایک ٹکڑا دھوپ کا'' 2000 میں سامنے آیا۔ ''سوریہ ونشی چندر ونشی'' ان کا مشہور افسانہ ہے اور ماڈرن عورت کا روپ ان کے متعدد افسانوں میں دکھائی دیتا ہے۔

ہمارے عہد کی وہ خواتین افسانہ نگار جو گذشتہ چند برسوں کے دوران دنیا سے رخصت ہوئی ہیں ان میں قمر جہاں، صغریٰ مہدی، تبسم فاطمہ اور ترنم ریاض کے نام بھی شامل ہیں۔ قمر جہاں بھاگلپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر تھیں اور اکتوبر 2010 میں سبکدوش ہوئیں۔ ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''پنجڑے کا قیدی'' 2015 میں شائع ہوا تھا اور چوتھے مجموعہ ''یادنگر'' کی ترتیب و اشاعت سے پہلے ہی ان کی وفات ہوگئی۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ قمر جہاں نام کی دو اور افسانہ نگار ابھی موجود ہیں۔ دوسری قمر جہاں بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر رہ چکی ہیں ان کا مجموعہ ''آخری دہلیز'' 1984 میں شائع ہوا تھا۔ تیسری قمر جہاں ناگپور کے LAD کالج میں فارسی کی استاد ہیں اور ان کا پہلا مجموعہ ''دھوپ چھاؤں'' 2005 میں دہلی سے اور دوسرا مجموعہ ''زندگی تیرے لیے'' 2012 میں ناگپور سے شائع ہوا۔

صغریٰ مہدی (پ: 1937 - و: 2014) جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں اردو کی پروفیسر تھیں۔ ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''پیش گوئی'' 2005 میں شائع ہوا تھا۔

اشرف جہاں (1951-2020) پٹنہ یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کے منصب سے 2015 میں سبکدوش ہوئی تھیں۔ ان کی تحقیق و تنقید کا میدان بھی اردو فکشن ہی تھا۔ 2009 میں ان کے اٹھارہ افسانوں پر مشتمل دوسرا مجموعہ ''اکیسویں صدی کی نرملا'' شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کے قابل ذکر افسانوں میں اکیسویں صدی کی نرملا (جس کے نام پر اس مجموعے کا نام بھی ہے)، میں اجنبی ہوں، بدر کامل، تمام عمر مسافر سفر میں رہتا ہے، موم کی مریم اور نائن الیون کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ عصری حسیت اور سماجی حقیقت نگاری ان کے افسانوں کا وصف خاص ہے۔ اشرف جہاں کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''اگر میں نہ ہوتی'' 2018 میں منظر عام پر آیا۔ عورت کی سماجی حیثیت اور نسائی حسیّت کا اظہار اس مجموعے کے افسانوں میں بھی نظر آتا ہے۔ افسوس کہ 2020 میں اشرف جہاں اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

تبسم جہاں (1972-2021) ناول، افسانہ، شاعری کے افق شعلۂ مستعجل بن کر طلوع ہوئی تھیں لیکن 2021 میں وہ بھی رخصت ہو گئیں۔ وہ مشہور فکشن نگار مشرف عالم ذوقی کی اہلیہ تھیں۔ کووڈ کی وبا میں ذوقی صاحب کا بھی 2021 میں انتقال ہوگیا۔ تبسم فاطمہ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''تاروں کی آخری منزل'' 2012 میں شائع ہوا تھا۔ تانیثی رجحان کا اثر ان کے فکشن میں نمایاں ہے۔ ان کے مجموعے کا نام فیض کے ایک مصرعہ سے ماخوذ ہے اور انھوں نے منٹو کی طرح ایک افسانہ نیا قانون کے عنوان سے بھی لکھا تھا۔

ترنم ریاض (1960- 20 مئی 2021) کا دوسرا مجموعہ ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' 2000 میں اور تیسرا مجموعہ ''یمبرزل (Yambirzal)'' 2004 میں سامنے آیا تھا اس کے بعد وہ شاعری، تنقید، تذکرہ اور ناول نگاری میں مصروف ہوگئیں۔ ان کے افسانے کشمیر کے قدرتی مناظر کی یاد دلاتے ہیں۔ توقع تھی کہ وہ افسانہ نگاری کے میدان میں بھی اور آگے جائیں گی لیکن 2021 میں وہ راہی ملک عدم ہوگئیں۔

جیلانی بانو (پ: 1936) کا شمار صفِ اول کی خواتین افسانہ

نگاروں میں ہوتا ہے۔وہ اپنے ناول ''ایوان غزل'' اور افسانوں میں ''موم کی مریم'' اور ''پرایا گھر'' کی بدولت ادبی دنیا میں بہت مقبول ہوئیں۔ان کے گیارہ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''بات پھولوں کی''2001 میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے کا نام مخدوم محی الدین کی مشہور غزل:

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی

سے ماخوذ ہے۔حیدرآبادی تہذیب کی عکاسی جیلانی بانو کے افسانوں کا وصفِ خاص ہے۔ان کا ایک اور مجموعہ ''راستہ بند ہے'' 2010 میں شائع ہوا تھا۔ڈاکٹر آصف فرخی نے جیلانی بانو کے افسانوں کا انتخاب بھی ''یقیں کے آگے گماں کے پیچھے'' مرتب کر کے مع مقدمہ 2014 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع کرا دیا تھا۔

ذکیہ مشہدی (پ:1944 لکھنؤ) کے تیرہ افسانوں پر مشتمل ان کا تیسرا مجموعہ ''صدائے بازگشت'' 2003 میں شائع ہوا۔اس میں ابّن ماموں کا بیٹھکا، بھیڑیے، بی بی کی نیاز، صدائے بازگشت اور طویل افسانہ ''قصہ جانکی رمن پانڈے'' قابل ذکر افسانے ہیں۔موخر الذکر افسانہ پہلے رسالہ ''شب خون'' میں اور پھر کراچی کے رسالہ ''آج'' میں اشاعت پذیر ہوا۔محمد عمر میمن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے 2011 میں (The Annual of Urdu Studies) میں شائع کرایا۔ذکیہ مشہدی کے دو اور مجموعے ''نقشِ ناتمام'' 2008 میں اور ''یہ جہانِ رنگ و بو'' 2023 میں منظر عام پر آئے۔2016 میں ان کے چالیس افسانوں کا انتخاب ''منتخب افسانے'' کے نام سے شائع ہوا۔ان مجموعوں میں بدّو کا ہاتھی، سارے جہاں سے اچھا، چھوٹی ریکھا بڑی ریکھا، باقی سر، مچھندر کی واپسی، انگوٹھی، مرغے کی ایک ٹانگ، گئے وقت کا ملبہ عمدہ افسانے ہیں۔وہ اپنے افسانوں کا پلاٹ گردوپیش کے واقعات سے تیار کرتی ہیں۔ان کے کردار بھی ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار معلوم ہوتے ہیں۔انسانی نفسیات کا گہرا شعور ان کے افسانوں میں دکھائی دیتا ہے۔''نقشِ ناتمام'' اور ''یہ جہانِ رنگ و بو'' دونوں مجموعوں کے نام علامہ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' اور جبریل و ابلیس'' کے مصرعوں سے ماخوذ ہیں۔

طاہرہ اقبال (پ:1960) ہمارے عہد کی ممتاز افسانہ نگار ہیں۔18 افسانوں پر مشتمل ان کا دوسرا مجموعہ ریخت 201 میں یونس جاوید کے دیباچہ کے ساتھ (دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد) منظر عام پر آیا۔اس میں راؤنڈ دی کلاک، انتخاب، ناگفتنی، چرواہا، جوڑا گھوڑا، وچولن قابل ذکر افسانے ہیں۔ان کا تیسرا مجموعہ ''گنجی بار'' اسد محمد خاں کے پیش لفظ کے ساتھ 2008 میں شائع ہوا اس میں 24 افسانے شامل ہیں جن میں لڑکیاں، شہزاد، ماں بیٹا اور....عزت، ماں ڈائن، اہم افسانے ہیں۔عمیر منظر نے طاہرہ اقبال کے منتخب افسانے کے نام سے ۱۷ افسانوں کا ایک انتخاب بھی مرتب کر کے مقدمہ کے ساتھ 2013 میں شائع کرا دیا تھا۔طاہرہ اقبال کا چوتھا مجموعہ بھی ''زمین رنگ'' کے نام سے 2014 میں شائع ہو چکا ہے۔

شائستہ فاخری (پ:1963 سلطان پور، یوپی) نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی۔ان کے 23 افسانوں پر مشتمل ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''اداس لمحوں کی خود کلامی'' 2011 میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر مغنی تبسم کے تعارفی مضامین کے ساتھ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوا اس مجموعے میں سنو رقیہ باجی، اداس لمحوں کی خود کلامی، کنور فتح علی اور پڑاؤ عمدہ افسانے ہیں۔

نعیمہ جعفری پاشا (پ1955) نے ''فرہنگ کلیات نظیر اکبرآبادی'' 2000 میں شائع کر کے تحقیق کی دنیا میں مقبولیت حاصل کی تھی لیکن ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں کی صف میں بھی بہت جلد امتیازی حیثیت حاصل کر لی۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ٹوٹا ہوا آدمی'' 2003 میں اور دوسرا مجموعہ ''مانو یا نہ مانو'' 2006 میں اور تیسرا ''دھوپ کے ساتوں رنگ'' 2012 میں منظر عام پر آیا۔

رخشندہ روحی مہدی کے تیرہ افسانوں پر مشتمل ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''مگر ایک شاخ نہال غم'' رتن سنگھ، بانو سرتاج اور صبیحہ انور کے دیباچہ کے ساتھ 2017 میں شائع ہوا۔اس مجموعے کا نام سراج اورنگ آبادی کی غزل کے ایک مصرعے سے ماخوذ ہے۔

مشہور شاعر مظہر امام کی اہلیہ صبیحہ امام (1940 ویشالی، بہار) کے افسانوں اور منی افسانوں کا پہلا مجموعہ ''پیاس کا صحرا'' 2001 میں شائع ہوا تھا۔اس مجموعے کے اہم افسانوں میں بڑے شہر کی لمبی کہانی، اکٹوپس، پیاس کا صحرا، میں اکیلی ہوں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔خانگی مصروفیات میں رہ کر انہیں ابھرنے کا موقع نہیں ملا۔باہمی رشتوں کے پیچ و خم اور انسانی نفسیات کی تصویریں ان کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

کہکشاں انجم (1948 آرہ، بہار) بہار کی اہم خواتین افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ان کا پہلا مجموعہ ''کہکشاں'' 2003 میں اور دوسرا ''کرچیاں'' کے نام سے 2006 میں شائع ہوا تھا۔

زینب نقوی (1963 سیوان) بھی 2004 میں اپنے افسانوی مجموعہ ''ریت کی دیوار'' کے ساتھ سامنے آئی تھیں لیکن پھر ان کا کوئی اور مجموعہ غالباً شائع نہیں ہوا۔

رینو بہل (پ:1958) پنجاب (چنڈی گڑھ) کی اہم افسانہ

نگار ہیں۔اب تک ان کے آٹھ افسانوی مجموعے بہ تفصیل ذیل شائع ہو چکے ہیں:

(۱) آئینہ۔2001 (۲) آنکھوں سے دل تک۔2005
(۳) کوئی چارہ ساز ہوتا۔2008 (۴) خوشبو میرے آنگن کی۔2010
(۵) بدلی میں چاند۔2012 (۶) خاموش صدائیں۔2013
(۷) دستک۔2016 (۸) ڈوبتی نسلیں۔2021

نسرین ترنم (پ:1960 گیا) بہار کی قابل ذکر خواتین فکشن نگاروں میں سے ایک ہیں۔اب تک ان کے تین ناول بھی شائع ہو چکے ہیں۔ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''منتظر'' 2007 میں، تیسرا مجموعہ ''شگاف'' کے نام سے 2014 میں اور چوتھا مجموعہ ''ابر'' کے نام سے 2015 میں شائع ہوا تھا۔

ثروت خان (پ:1960 ٹونک، راجستھان) راجستھان کی مشہور فکشن نگار، محقق اور نقاد ہیں۔ان کا افسانوی مجموعہ ''ذروں کی حرارت'' 2004 میں منظر عام پر آیا تھا۔وہ اپنے افسانوں میں بعض اوقات تجریدی اور علامتی پیرایۂ بیان بھی اختیار کر لیتی ہیں۔اس مجموعہ کے قابل ذکر افسانوں میں سمرپن، زندگی اور موت، چوتھا گھونٹ اور دو گز زمین کے نام لیے جا سکتے ہیں۔راجستھانی ماحول اور پس منظر اور وہاں کی تہذیب وثقافت کی جھلکیاں ان کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔

ڈاکٹر شہناز شاہین نے اردو افسانے پر مغربی اثرات اور اردو ناولوں اور افسانوں پر یورپی فکشن کے اثرات کے موضوع پر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے ایم فل اور پی ایچ۔ڈی کی تھی۔ان کے دونوں مقالے 1999 اور 2001 میں شائع ہو چکے ہیں۔وہ محقق اور نقاد کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی ادبی دنیا میں روشناس ہوئیں اور ان کا افسانوی مجموعہ ''ڈیوائیڈر'' 2005 میں شائع ہوا۔ ملازمت اور گھریلو مصروفیات نے اب شاید ان کے قلم کی روانی پر روک لگادی ہے تاہم ڈیوائیڈر کے افسانوں کو قارئین کے حلقے میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

بانو سرتاج (پ:1945 مہاراشٹر) کا تخلیقی سفر تقریباً پچاس برسوں سے جاری ہے۔فکشن نگاری کے ساتھ ساتھ انھوں نے تاریخ، تحقیق وتنقید اور بچوں کے ادب سے متعلق بھی قابل قدر تصانیف پیش کی ہیں۔ان کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ''ذراسی کمی'' 2001 میں اور چوتھا مجموعہ اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا میزان 2009 میں شائع ہوا تھا۔

کرناٹک کی اہم افسانہ نگار سلمیٰ صنم (1966 منگلور، کرناٹک) کے چار مجموعے بہ تفصیل ذیل شائع ہو چکے ہیں:

(1) طور پر گیا ہوا شخص۔2007 (2) پت جھڑ کے لوگ۔2012
(3) پانچویں سمت۔2016 (4) قطار میں کھڑے چہرے اور دیگر افسانے۔2018

سلمیٰ صنم نے خواتین کی گھریلو الجھنوں کو زیادہ تر اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

قمر جمالی (1948۔حیدرآباد) کے چار افسانوی مجموعے ہیں جن میں تیسرا مجموعہ سحاب کے نام سے 2001 میں اور چوتھا زہاب کے نام سے 2007 میں شائع ہوا۔

انور نزہت (1936۔آگرہ) کا تیسرا افسانوی مجموعہ تنہائی کا زہر 2011 میں شائع ہوا۔عورت کی خانگی زندگی اور معاشی ومعاشرتی مسائل ان کی کہانیوں کا خاص موضوع ہیں۔ان مجموعے کے قابل ذکر افسانوں میں تنہائی کا زہر، مہاجر، جوڑا، آخری فیصلہ اور تلاش کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

نوشابہ خاتون (1945 پٹنہ) کا پہلا افسانوی مجموعہ نقار خانہ 2006 میں اور 26 افسانوں پر مشتمل دوسرا مجموعہ ''بالا دست'' 2009 میں عبدالصمد اور حیدر قریشی کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوا اور تیسرا مجموعہ خلیج 2019 علیم اللہ حالی، ارمان نجمی اور منظر اعجاز کے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔ان کے افسانوں کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں کہانی لکھنے کا سلیقہ اور زبان وبیان پر قدرت ہے۔

صبیحہ انور (1948) جنھوں نے اردو میں خود نوشت سوانح حیات (1982) پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا، ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ خواب در خواب 2010 میں شائع ہوا۔اس میں 26/افسانے شامل ہیں۔اس مجموعے کے اہم افسانوں میں جیون گیان، سیڑھیاں، بند کھڑکی، واپسی، بدلتا ہوا منظر قابل ذکر افسانے ہیں۔

شہناز رحمٰن کی ولادت نیپال میں ہوئی تھی لیکن انہوں نے علی گڑھ میں اعلا تعلیم حاصل کی۔فکشن کی نقاد کی حیثیت سے وہ ادبی افق پر طلوع ہوئیں۔2016 میں ان کے 23/افسانوں کا مجموعہ ''نیرنگ جنوں'' پیغام آفاقی، شموئل احمد اور حامد سراج کے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔اس مجموعے کا نام فانی بدایونی کی غزل کے مطلع سے ماخوذ ہے۔پروفیسر قدوس جاوید نے اس مجموعے کو رنگا رنگ تجربات کا نگار خانہ قرار دیا ہے۔ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شہناز رحمٰن کیے افسانوں کا کینوس کافی وسیع ہے..........
.اس وسعت اور زبان وبیان کی وجہ سے ان کے افسانوں میں قرۃ العین حیدر کا افسانوی رنگ نظر آنے لگتا ہے''۔

آشا پربھات (1958۔ریکسول، بہار) بھی نیپال کے قریبی

علاقہ ریکسول کی رہنے والی ہیں ۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ وہ دن 2015 میں شائع ہوا تھا۔

انجم قدوائی (1955۔سلطان پور، یوپی) غزال ضیغم کی بڑی بہن ہیں۔انکا پہلا افسانوی مجموعہ ''ریت کا ماضی'' 2017 میں شائع ہوا۔ان کے افسانوں میں کہانی پن اور زبان و بیان کا حسن قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

فرزانہ اسلم (1957۔گیا) نے ''عصمت چغتائی بہ حیثیت ناول نگار'' کے موضوع پر پٹنہ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی اور ''سعادت حسن منٹو: حیات اور افسانے'' کے موضوع پر ڈی۔لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ان کے دونوں مقالے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔فکشن کی تحقیق وتنقید ہی ان کی دلچسپی کا خصوصی میدان ہے۔ان کی کہانیاں بھی مقتدر رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔۲۰۱۲ء میں ان کا افسانوی مجموعہ ''ٹھنڈی آگ'' شائع ہوا۔

فرح جاوید (1969۔علی گڑھ) نے دہلی یونیورسٹی سے ''اردو فکشن اور علی گڑھ'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''آخری راستہ'' 2015 میں شائع ہوا۔دوسرا زیر ترتیب ہے۔

یاسمین اختر (بھاگلپور) نے بھاگلپور یونیورسٹی سے ''جدید اردو افسانے میں تصور زن'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ فکشن تنقید سے انہیں دلچسپی ہے۔وہ افسانہ اور ناول دونوں میں شہرت حاصل کر چکی ہیں۔اب تک ان کے چار افسانوی مجموعے بہ تفصیل ذیل شائع ہو چکے ہیں:

(1) گھر کی زینت۔2014 (2) سلسلہ۔2015

(3) نذرانہ۔2017 (4) لوگ کیا کہیں گے۔2019

رومان کے ساتھ ساتھ انہوں نے معاشرہ کے تلخ حقائق اور خانگی زندگی کے مسائل کو سادہ اور دلچسپ بیانیہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔

افشاں ملک (1962۔بریلی) نے احمد ندیم قاسمی: آثار وافکار کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ان کا افسانوی مجموعہ ''اضطراب'' 2017 میں شائع ہوا۔

خالدہ ناز (1971۔ہزاری باغ جھارکھنڈ) نے پروین شاکر: حیات اور کارنامے کے موضوع پر پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔ بھاگلپور کے ایک کالج میں استاد ہیں۔ان کا افسانوی مجموعہ ''آخری لمس'' 2016 شائع ہوا تھا۔

صادقہ نواب سحر (1957۔کنگور، آندھرا پردیش) آندھرا پردیش کی مستند اور صاحب طرز قلم کار ہیں۔انہوں نے ناول، افسانہ، شاعری، بچوں کا ادب، ڈراما اور تنقید میں شہرت حاصل کی۔ناولوں اور شعری مجموعے کے علاوہ ان کے تین افسانوی مجموعے بہ تفصیل ذیل شائع ہو چکے ہیں:

(1) منّت۔2012 (2) خلش بے نام سی۔2013

(3) پیج ندی کا مچھیرا۔2018

علاقائی تہذیب وثقافت اور قدرتی مناظر کی رنگا رنگ تصویریں ان کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔

لالی چودھری (1950۔پاکستان) 1973 میں پاکستان سے امریکہ منتقل ہو گئی تھیں۔اس لیے ان کے افسانوں کا کینوس بہت وسیع ہو گیا اور انہوں نے لاس انجلیس اور امریکہ کے دوسرے شہروں میں مقیم پاکستانی اور غیر ملکی افراد کی زندگی کے مسائل، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کو اپنے افسانوں میں سلیقہ کے ساتھ جگہ دی۔ادارۂ شعر وحکمت حیدر آباد کے اہتمام سے لالی چودھری کا افسانوی مجموعہ ''حد چاہیے سزا میں'' 2002 میں پروفیسر شمیم حنفی کے عمدہ پیش لفظ کے ساتھ شائع ہوا۔

سلمیٰ جیلانی (1962) افسانہ نگار، شاعرہ اور مترجم ہیں۔کراچی سے 2001 میں وہ نیوزی لینڈ منتقل ہو گئیں۔وہ رسالہ ''دیدبان'' کی شریک مدیر ہیں۔ان کا افسانوی مجموعہ ''پیوند'' 2017 میں شائع ہوا۔''عشق پیچاں'' ان کا بہت مشہور افسانہ ہے۔

عنبری رحمٰن (1966۔موتیہاری، بہار) کے دو افسانوی مجموعے ''مٹی کی خوشبو'' اور ''رنگ حیات'' 2010 میں شیخ عقیل احمد نے مرتب کر کے شائع کیے۔انسانی رشتوں کی شکست وریخت عنبری رحمٰن کے افسانوں کا اہم موضوع ہے اور اس معاملے میں وہ بہت حساس دکھائی دیتی ہیں۔

شہیرہ مسرور بنگال کی نامور خواتین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتی ہیں۔سفر سے واپسی ان کا مجموعہ ہے۔

شکیلہ بانو (ش۔بانو) کا افسانوی مجموعہ بابو جی کی بیٹی، ۲۰۱۷ء میں دہلی سے شائع ہوا۔وہ مشہور شاعر نیر قریشی گنگوہی کی اہلیہ ہیں۔عورت کی گھریلو زندگی کے تجربات کا بیان ان کے افسانوں کا اہم موضوع ہے۔

مہر افروز کا مجموعہ ''ٹوٹی ہوئی سرحدیں'' 2021 میں ممبئی سے شائع ہوا ہے۔اور نیلوفر پروین (بہار) کا مجموعہ جوہی کی کلی بھی 2021 میں منظر عام پر آیا ہے۔

ناہید طاہر جہانیہ رائچور کی رہنے والی ہیں لیکن گزشتہ کئی برسوں سے سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ان کا افسانوی مجموعہ ''چاند تیسری شب کا'' حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔

شیریں نیازی کا آبائی وطن سہسرام ہے اور فی الحال کرام گڑھ (جھارکھنڈ) میں مقیم ہیں وہ 1960 سے افسانہ نگاری کی طرف مائل ہیں اور دوسو سے زائد افسانے لکھ چکی ہیں جو رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کا کوئی مجموعہ ہمیں دیکھنے کو نہیں ملا۔ البتہ ایوان اردو دہلی مئی 2022 کے شمارے میں ان کا افسانہ ''میمنی'' اور ماہنامہ آج کل، نئی دہلی اگست 2022 کے شمارے میں افسانہ ''عدت گھر'' شائع ہوا ہے۔

رخسانہ نازنین بیدر (کرناٹک) کی ممتاز افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ 1992 سے وہ افسانے لکھ رہی ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ طوبیٰ 2010 میں اور دوسرا ''ضیاء'' کے نام سے 2012 میں شائع ہوا۔ تیسرا مجموعہ ''پس دیوار'' کے نام سے 2019 میں منظر عام پر آیا۔ وہ اصلاحی مقاصد کے پیش نظر افسانے لکھتی ہیں۔ ان کا تازہ افسانہ ''آن لائن عشق'' ماہنامہ زبان وادب (پٹنہ) جنوری 2022 میں شائع ہوا ہے۔ اسی طرح شبانہ پروین (پٹنہ، بہار) کا افسانہ ''مرغی کا ڈربا'' بھی زبان وادب کے شمارہ ستمبر 2021 میں شائع ہوا ہے۔

اکیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں کے اس مختصر سے جائزے کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بیس بائیس سال کے دوران تقریباً چالیس خواتین افسانہ نگار اپنی تخلیقی توانائیوں کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ ہم عصر افسانہ نگاری کی دنیا میں مردوں کی اتنی بڑی تعداد دکھائی نہیں دیتی۔ خواتین افسانہ نگاروں کے بارے میں بڑی آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع نہیں ہے اور یکسانیت بہت زیادہ ہے۔ یہ بات کسی حد تک تو درست ہے لیکن ایسا کیوں ہے؟ ہمیں اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں نے گھریلو زندگی کے مسائل پر زیادہ توجہ صرف کی ہے اور ظاہر ہے کہ مسائل اور ان کے حل کی شروعات گھر ہی سے ہونی چاہیے، اس کے بعد پھر معاشرے اور ملک وقوم کے مسائل و معاملات تک بات پہنچتی ہے۔ مردوں کی بے اعتنائی، عورتوں کے جبر د استحصال، رشتوں کی شکست و ریخت، خاندانوں میں باہمی چپقلش اور کشیدگی، بغض وحسد، اقدار کی پامالی، لالچ، عیّاری، دھوکہ اور فریب، وعدہ خلافی، خودغرضی اور مفاد پرستی، معاشی تنگی، غربت وافلاس، نا آسودگی، طبقاتی کش مکش، عصبیت، لڑکیوں کی شادی، جہیز کی لعنت اور اسی طرح کے مسائل بالعموم خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں اور سب نے اپنے اپنے ذوق وظرف اور فنی شعور کے مطابق ان مسائل کو اپنے بیانیے کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اب اگر شادی بیاہ کے مسئلے کو ہی لے لیجیے تو ظاہر ہے کہ ''چوتھی کا جوڑا'' جیسے افسانے کی تخلیق تو ہر کسی کے بس کی بات نہیں لیکن یہی کیا کم ہے کہ خواتین افسانہ نگار ہماری خانگی اور معاشرتی زندگی کے اہم مسائل کو اپنے فکشن میں جگہ دے رہی ہیں تا کہ پڑھنے والوں کا خوابیدہ ضمیر کچھ تو بیدار ہو۔ مسائل سے متعلق بیداری ہی مسائل کے حل کی اولین شرط ہے اور اس سلسلے میں خواتین اپنے حصے کا فرض پوری طرح سے نبھا رہی ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں کی فنی تدابیر، تکنیک اور اسلوب کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے علامت، تجرید، شعور کی رو، فلش بیک وغیرہ جیسی تکنیک کے مقابلے میں سادہ اور سہل بیانیے کو ترجیح دی ہے۔ اس سلسلے میں اب ہمیں یہ بات بھی کہنی چاہیے کہ پریم چند کے سادہ اور دلکش بیانیے کی بازیافت میں ہمارے عہد کی بیشتر خواتین افسانہ نگاروں کی ہی کوششوں کا دخل زیادہ ہے۔ انور سجاد اور نیر مسعود جیسے فکشن نگاروں کے پیچیدہ اور تہ درتہ بیانیے کو سمجھنے میں آج کا مصروف قاری اکثر مشکلوں سے دوچار ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں معاصر خواتین افسانہ نگاروں کا سادہ اور دلچسپ بیانیہ زیادہ پرکشش اور قابل فہم محسوس ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں خواتین افسانہ نگاروں کے تخلیقی امکانات سے بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

□□□

Prof. Shahabuddin Saqib
4/4.D2. Maskan
Shamshad Market, Qila Road
Aligarh.202002 (U.P.)
Cell.6396407595

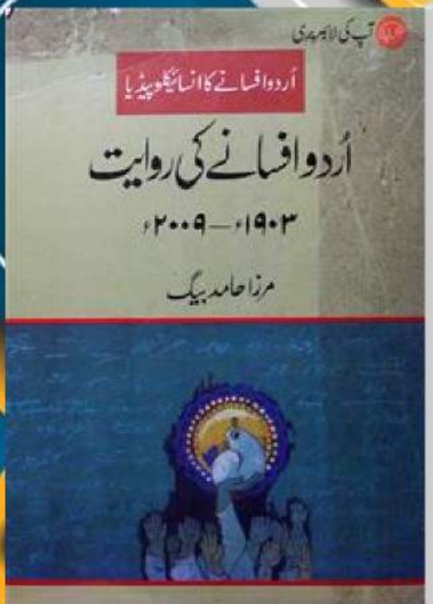

ڈاکٹر نصرت جبین

'فوٹو گرافر' میں وقت کی حاکمیت کا بیانیہ

زیرِ تجزیہ افسانہ فوٹو گرافر اردو دنیا کی ممتاز و معروف تخلیق کار اور دانشور قرۃ العین حیدر کی تخلیق ہے جسے موصوفہ نے زندگی کی ایک ابدی سچائی کے فن کارانہ اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے افسانے عام طور پر طویل ہوتے ہیں مگر افسانہ فوٹو گرافر مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ علامتی ہونے کی وجہ سے معنی و مفہوم کی کئی تہیں اور جہتیں اپنے اندر پوشیدہ رکھے ہوئے ہے۔

وقت اور فنا کا بے رحم تعلق اس افسانے کا اصل موضوع ہے افسانے میں زندگی اور فنا کے فلسفے کو سمو کر وقت کو ایک بے رحم اور سفاک شئے کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے فکشن کے بڑے حصے میں تصورِ وقت کو برتا ہے اس ضمن میں ان کا ناول ''آگ کا دریا'' اس کی زندہ مثال ہے یہاں پر بھی انہوں نے اپنے اسی دلچسپ موضوع کو افسانے کے پیرایۂ میں بیان کیا ہے۔

افسانے میں بیان کردہ دلچسپ ماجرا ایک لڑکی کی جوانی سے لے کر بڑھاپے تک کے مختلف مناظر کا احاطہ کرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے سب سے پہلے گیسٹ ہاوس کے جغرافیہ کا بیان کیا ہے یہیں پر مصنفہ نے فوٹو گرافر کا تعارف پیش کرتے ہوئے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس گیسٹ ہاوس میں کیسے کیسے اور کون کون مہمان کن کن وقتوں میں آتے رہے ہیں۔

''ایسے لوگ جو سکون اور محبت کے متلاشی ہیں جس کا زندگی میں وجود نہیں کیونکہ ہم جہاں جاتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے ہم جہاں ٹھہرتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہیں فنا مسلسل ہماری ہم سفر ہے۔۔۔۔۔۔۔فوٹو گرافر کے کیمرے کی آنکھ یہ سب دیکھتی اور خاموش رہتی ہے''۔

('فوٹو گرافر'، از قرۃ العین حیدر، مشمولہ اُردو افسانے کی روایت: 1903 تا 2009 مرتب مرزا حامد بیگ، عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹیڈ، دہلی، فروری 2014، ص: 954)

فوٹو گرافر کے کردار کے ذریعے مصنفہ نے زندگی اور حقیقتِ زندگی کو علامتی انداز و اسلوب میں پیش کرنے کی فنکارانہ کوشش کی ہے فوٹو گرافر کی مصوری گزرتے دنوں کا آئینہ دکھاتی ہے یعنی فوٹو گرافر وقت کے سیلِ رواں کے بہاؤ کی طغیانیوں اور جولانیوں کا نظارہ کرا رہا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ایک فوٹو گرافر کے ذریعے کھینچے گئے فوٹو کے وسیلے سے گزرے وقت اور اس سے پیدا ہونے والی تبدیلی پر تبصرہ کیا ہے یہ ماضی او رحال کو سمیٹ کر اپنے دامن میں رکھتا ہے مصنفہ کے تصورِ وقت کے تناظر میں علامہ اقبال کے یہ اشعار میرے حافظے پر دستک دے رہے ہیں کہ:

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

ساقی نامہ، بالِ جبریل (اقبال)

آگے افسانہ نگار ہمیں بتاتی ہیں کہ ایک روز شام ہوتے ہی ایک لڑکی اور جوان شخص گیسٹ ہاؤس میں داخل ہوتے ہیں مگر یہ دونوں ماہِ عسل (Honey Moon) منانے والے نہیں لگتے ہیں جب دونوں اپنے اپنے کمروں میں ٹھہر جاتے ہیں تو کمرے کے باہر کا منظر یہ پیش کیا جاتا ہے۔

''کمرے کے بڑے بڑے دریچوں میں سے وہ مزدور نظر آ رہے تھے جو ایک سیڑھی اُٹھائے پچھلی دیوار کی مرمت میں مصروف تھے''۔(ایضاً،ص:955)

گیسٹ ہاؤس کی مرمت ہونے سے ہمارا خیال اس کے پرانے ہو کر خستہ اور بدحال ہونے کی طرف جاتا ہے عمارت کے مرمت پذیر ہونے میں افسانہ نگار نے اس کے فنا ہو جانے کا اشارہ پوشیدہ رکھا ہے۔ آگے جا کر مصنفہ نے ڈائنگ ہال کے منظر کو بیان کیا ہے کہ ایک یورپین سیاح ڈائنگ ہال کے دوسرے کونے میں چپ چاپ بیٹھا خط لکھ رہا ہے۔ لڑکی اس کو دیکھ کر اپنے ساتھی سے کہتی ہے۔

''یہ اپنے خط میں لکھ رہا ہے کہ میں اس وقت پراسرار مشرق کے ایک پراسرار ڈاک بنگلے میں موجود ہوں۔ سرخ ساڑھی میں ملبوس ایک پراسرار ہندوستانی لڑکی میرے سامنے بیٹھی ہے''۔(ایضاً،ص:955)

یہاں پر مصنفہ نے تین جملوں میں تین بار 'پراسرار' لفظ استعمال کیا ہے۔ مشرق بھی پراسرار، گیسٹ ہاؤس بھی پراسرار اور ہندوستانی لڑکی بھی پراسرار۔ دراصل قرۃ العین حیدر نے اس یورپین سیاح کے ذریعے سے یورپ یا مغرب کے اس تصور کو ظاہر کیا ہے جو وہ مشرق اور اہلیانِ مشرق سے متعلق رکھتے ہیں مغربیوں کے مقابلے میں مشرقیوں کے ہاں روحانیت اور ان کی صلاحیتیں پوشیدہ و پُراسرار ہیں۔ مشرق اپنی سرشت میں اَن گنت جمالیاتی اقدار اور فکری ابعاد کا ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں کوئی بھی صاحبِ نظر اور صاحبِ فکر اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔

اگلے منظر میں یہ جوڑا ڈائنگ ہال سے نکل کر میٹنگ روم میں آ جاتا ہے۔ دفعتاً لڑکی کو زور کی چھینک آتی ہے اس نے سوں سوں کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا ''اب سونا چاہیے''۔ نوجوان جواب میں کہتا ہے تم اپنی زکام کی دوا پینا نہ بھولنا۔ لڑکی اس کو شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ کچھ لمحوں بعد ہی نوجوان بھی زکام محسوس کرتا ہے۔ لڑکی کے دروازے پر دستک دے کر اس سے دوا کی شیشی مانگ کر اپنے کمرے کی طرف واپس چلا جاتا ہے۔ لڑکی روشنی بجھا کر سو جاتی ہے۔

یہاں افسانہ نگار نے قارئین کو یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ لڑکی اور جوان کوئی عیاشی یا کسی اور ایسے جذبے کی تسکین کے لیے نہیں آئے ہوئے ہیں بلکہ انھیں دراصل عارضی گمنامی کا وقفہ اور مکمل سکون درکار تھے۔ جو انھیں یہاں میسر آ گئے اور قاری اس خیال سے باہر آ جاتا ہے جو اس جوڑے کے متعلق ذہن میں قائم ہو گیا تھا۔

رات گزر جانے کے بعد دونوں صبح مسکراتے ہوئے ناشتہ مکمل کر لیتے ہیں گیسٹ ہاؤس کا مالی لڑکی کے لیے نوجوان کے ہاتھوں ایک گل دستہ بھجواتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ باغ میں ایک فوٹو گرافر تمھارے متعلق جانکاری لے رہا تھا۔ دونوں نیچے باغ میں جاتے ہیں فوٹو گرافر نے حاضر ہو کر کہا:

''باہر کارزارِ حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے مجھے معلوم ہے اس گھمسان سے نکل کر آپ دونوں خوشی کے چند لمحے چرانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔۔۔۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا ادھر آئیے''۔(ایضاً،ص:956)

قرۃ العین حیدر نے فوٹو گرافر کے منہ سے یہ جملے ادا کروا کے آج کی تیز رفتار زندگی کی پر پیچ صورت حال کو پیش کیا ہے۔ لڑکی اور اس کا ساتھی امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب کھڑے ہو کر تصویر اتروا لیتے ہیں۔ پاروتی کو ہندو Mythology میں لازوال حسن کی دیوی قرار دیا گیا ہے۔ پاروتی کے مجسمے کے ساتھ تصویر اتروا کر لڑکی کا حسن بھی اس تصویر میں لازوال ہو چکا ہے۔ دوسری صبح وہ واپس جا رہے تھے ناشتے کے بعد لڑکی ابھی اپنے کمرے میں ہی تھی کہ بیرا تصویر لے کر آیا۔ لڑکی نے اسے یہ تصویر دراز میں رکھنے کو کہہ دیا۔ لڑکی اور اس کا ساتھی جلدی جلدی تیار ہو کر گیسٹ ہاؤس سے رخصت ہو گئے اور وہ اس لفافے کو دراز سے نکالنا بھول جاتی ہے۔

اب افسانے کا تیسرا اور آخری حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس واقعے کے تقریباً پندرہ برس بعد وہی لڑکی اُسی گیسٹ ہاؤس کے اُسی کمرے میں آ کر ٹھہرتی ہے مگر اس بار وہ اکیلی ہوتی ہے اور اب وہ بڑی عمر کی ایک عورت ہے۔ وہ والرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹو گرافر بھی بہت بوڑھا ہو چکا ہے اور اسی طرح سیاحوں کی تصویریں اتارتا رہتا ہے۔ چائے کے بعد بڑی عمر کی یہ عورت خالی میٹنگ روم میں جا بیٹھی اور رات ہوئی تو جا کر اپنے کمرے میں سو گئی۔ یہ عورت جب اس کمرے میں پندرہ سال پہلے ٹھہری تھی۔ اس وقت گیسٹ ہاؤس کی پچھلی دیوار کی مرمت ہو رہی تھی۔

اورسوتے وقت اس کے ساتھی نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے کراس سے دوا کی شیشی لی تھی۔ آج پندرہ سال بعد اسے وہی سب کچھ محسوس ہورہا ہے جومدتوں پہلے ہوا تھا۔

''کچھ پرچھائیوں نے اندر جھانکا تو وہ اُٹھ کر دریچے میں
گئیں جہاں مزدور دن بھر کام کرنے کے بعد سیڑھی دیوار
سے لگی چھوڑ گئے تھے۔۔۔۔۔ وہ پھر پلنگ پر آ کرلیٹیں تو
چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ انھوں نے دروازہ
کھولا باہر کوئی نہ تھا۔۔۔ وہ پھر آ کرلیٹیں''۔(ایضاً،ص:957)

قرۃ العین حیدر بتانا چاہتی ہیں کہ انسان کا حال اس کے ماضی سے پیوست ہوتا ہے جس کو ناسٹیلجیا کہتے ہیں۔ مصنفہ کے فکشن کا ایک بڑا حصہ ناسٹیلجیائی ادب میں ہی شمار ہوتا ہے۔

دوسرے دن کی صبح اُٹھ کر عورت نے اپنا سامان باندھتے ہوئے سنگار میز کی دراز کھولی تو اسے اس تصویر کی بازیافت ہوتی ہے جو وہ پندرہ سال پہلے اس دراز میں بھول گئی تھی ایک کاکروچ لفافہ کی تہہ میں سے نکل کر خاتون کی انگلی پر آ گیا۔ انھوں نے انگلی جھٹکی اور چند لمحوں تک گم سم اس تصویر کو دیکھتی رہی۔ پھر اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ افسانہ نگار یہ باور کرا رہی ہیں کہ جب انسان دنیاوی ذمہ داریوں، رنگینیوں اور جھمیلوں میں الجھا ہوا ہوتا ہے۔ اس وقت اسے مذہبی ذمہ داریاں رشتے اور دوسرے اہم کام یا تو غیر ضروری محسوس ہوتے ہیں یا انھیں نبھانے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ مگر جب دنیا اُسے بہ چشمِ کم دیکھتا ہے اور اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے۔ تو یہی انسان بحرِ فکر میں غرق ہو کر اپنے ماضی اور اُس کے خوب و زشت سے ہچکولے کھاتا ہے تو وہ پل دو پل کے لیے ماضی پرستی کا چولہ پہن لیتا ہے۔

افسانے کے آخری پیراگراف میں خاتون نیچے گئی حسب معمول فوٹوگرافر نئے مسافروں کی تاک میں سڑک پر ٹہل رہا تھا۔

''فوٹو گرافر نے چونک کر ان کو دیکھا اور پہچاننے کی کوشش
کی۔ پھر خاتون کے جھریوں والے چہرے پر نظر ڈال کر اُکم
سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ان کی تو آواز بھی بدل چکی تھی۔
چہرے پر دُرشتی اور سختی تھی اور انداز میں چڑ چڑا پن اور بے
زاری اور وہ سپاٹ آواز میں کہے جا رہی تھی 'میں اسٹیج سے
ریٹائر ہو چکی ہوں۔ اب میری تصویریں کون کھینچے بھلا''۔

(ایضاً،ص:958)

افسانہ نگار نے یہاں پر ظاہر کیا ہے کہ گلیمر(Glamour)، شوبز(Showbiz)، ماڈلنگ(Modeling) ، انٹرٹیمنٹ(Entertainment)، ایر ہوسٹس(Air Hostes) اور دوسرے ایسے بے شمار شعبوں سے تعلق رکھنے والی خواتین صرف اسی وقت تک ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں جب تک ان کا ظاہری حسن اور رکھ رکھاؤ دلکش ہے۔ جوں ہی ان کی جوانی ڈھل جاتی ہے ان کے ساتھی، مداح اور میڈیا ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ افسانہ ''فوٹوگرافر'' میں موجود خاتون کردار اسی المیہ کا شکار ہے جب وہ کہتی ہے ''میں اسٹیج سے ریٹائر ہو چکی ہوں اب میری تصویریں کون کھینچے گا بھلا''۔ اسی بات کو قرۃ العین حیدر نے اپنے مشہور ناول ''آگ کا دریا'' میں چمپا بائی کی صورت میں بھی ہمارے سامنے پیش کیا ہے کہ کلکتے کا سرل ایشلے بھی جب لکھنؤ کا دورہ کرتا ہے تو وہ چمپا بائی سے ضرور ملتا ہے اس پر ہزاروں روپے اُڑا دیتا ہے۔ چمپا بائی کے دوستوں اور عاشقوں کا حلقہ کافی وسیع ہو جاتا ہے۔ لکھنؤ کے نواب کمال رضا خان اور لکھنؤ کے ریذیڈنٹ بھی ان میں شامل ہیں۔ گوتم نیلمبر دت جب جوانی میں لکھنؤ آتا ہے تو وہ بھی چمپا بائی سے جڑ جاتا ہے۔ ادھیڑ عمر میں جب یہی نیلمبر دت، پروفیسر نیلمبر دت بن کر لکھنو آتا ہے تو اسے ایک بھکارن ملتی ہے۔ یہ بکھارن چمپا بائی ہی ہوتی ہے۔ یہ وہی عورت ہے جس کے ایک اشارے پر لوگ جان دینے کو تیار رہتے تھے۔ جوانی ڈھل جانے کے بعد اس عورت کو بھکارن بن کر بھیک مانگنا پڑتا ہے۔

اس افسانے میں قرۃ العین حیدر نے ان پیشوں کے تاریک پہلوؤں کو دکھانے کی کوشش کی ہے جو عورت کی جسمانی نمائش پر قائم ہیں۔ وقت انسان کے روپ، اس کے رنگ اور اس کی جوانی کو چھین لیتا ہے اور اس کو ایک حسرت اور یاس کی تصویر بنا دیتا ہے۔

فوٹوگرافر جب اس عورت سے پوچھتا ہے کہ آپ کا ساتھی کہاں ہے جو پندرہ برس قبل آپ کے ساتھ تھا تو جواباً وہ عورت فوٹوگرافر کو کہتی ہے کہ آپ نے کہا تھا نا کہ:

''کہ کارزارِ حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے''۔ اس گھمسان
میں وہ کہیں کھو گئے۔۔۔۔ زندگی انسانوں کو کھا گئی صرف
کاکروچ باقی رہیں گے''۔(ایضاً،ص:958)

کاکروچ سے یہاں وقت مراد ہے کہ سب کچھ فنا ہو جائے گا کائنات کا ہر ذرہ ہر لحہ فنا کی جانب گامزن ہے صرف وقت ہی باقی رہے گا۔ اس وسیع کائنات میں انسان ہی واحد وجودِ ہستی ہے جو شعور و آگہی رکھتا ہے اسی لیے انسان پر دوسری ذی روح ہستیوں کے مقابلے میں وقت کے حادثات و واقعات کا زیادہ گہرا اثر پڑتا ہے۔ کاکروچ کے ذریعے وقت کی تند و تیز لہر کو پیش کرنا قرۃ العین کا ہی امتیاز ہے۔ جس کی طرف

انھوں نے اپنے فکشن میں جستہ جستہ بلیغ اشارے کیے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل اختر نے ایک انٹرویو کے دروان قرۃ العین حیدر سے پوچھا تھا کہ ”زندگی انسانوں کو کھا گئی صرف کاکروچ باقی رہیں گے“ اس جملے کی فلسفیانہ تعبیر آپ کے نزدیک کیا ہے:

”مرحومہ نے جواب دیا تھا کہ ”کاکروچ ایسی سخت جان ہے کہ ایٹم بم کا آخری دھماکہ ہونے کے باوجود بطور جاندار صرف وہی زندہ رہے گا باقی وجودیاتی ہستیاں فنا ہو جائیں گیں“۔

(’اندازِ بیاں اور‘ (قرۃ العین حیدر سے بات چیت) مرتب: ڈاکٹر جمیل اختر، فرید بک ڈپوئی دہلی، جولائی 2005، ص:248)

ماہرین کا بھی یہی کہنا ہے کہ ایٹم بم کے دھماکے کے بعد اگر کسی زندہ روح کے بچنے کا امکان ہے تو وہ صرف کاکروچ ہی ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ فنا سے کسی کو نجات نہیں اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

افسانہ نگار اصل میں وقت کی حاکمیت کو پیش کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن اس پیش کش میں کچھ غیر فطری واقعات کو راہ ملی ہے جیسے فوٹو گرافر کا ذریعۂ روزگار تصویر کشی ہے۔ ظاہر ہے وہ گیسٹ ہاؤس میں آنے والے ہر سیاح کی تصویر لینے کی کوشش کرتا ہے تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیسے کما سکے مگر افسانہ نگار نے اسے تصویر کھینچنے کے معاملے میں ایک معیار قائم کئے ہوئے دکھایا ہے:

”فوٹو گرافر کوچ دیکھتے ہی فوراً اُٹھ کھڑا ہوا تھا، مگر کسی جوان اور حسین لڑکی کی بجائے ایک ادھیڑ عمر کی بی بی کو دیکھ کر مایوسی سے دوبارہ جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ چکا تھا“۔

(’فوٹو گرافر‘، ص:958)

اسی طرح دوسری غیر فطری بات افسانے میں موجود عورت کی عمر کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔ مصنفہ نے افسانے میں موجود واحد خاتون کردار کو پندرہ سال پہلے سرخ ساڑھی میں ملبوس ایک پراسرار ہندوستانی لڑکی کے روپ میں پیش کیا ہے جو ایک نامور رقاصہ تھی اور پندرہ سال بعد اسی کردار کو افسانہ نگار چہرے پر جھریوں کا جال بچھائے ہوئے اور مزاج میں دُرشتی سختی اور چڑ چڑے پن کے ساتھ متعارف کراتی ہیں۔ آواز بھی سپاٹ ہو چکی ہے مگر انسانی عقل اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ پندرہ سال پہلے یہ مشہور رقاصہ ایک لڑکی کی عمر کی تھی اور اب پندرہ سال بعد یہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت بن چکی ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ فنون لطیفہ اور Entertainment کی دنیا سے تعلق رکھنے والی خواتین ظاہری رکھ رکھاؤ کو برقرار رکھنے کے لیے Modern Scientific Treatments کے بہت سارے طریقے اختیار کرتی رہتی ہیں جیسے Cosmatic Surgeries اور Face lifting وغیرہ یہاں پر بطور خاص قابلِ ذکر ہیں غور طلب بات یہ ہے کہ اگر یہ خاتون کردار پندرہ سال پہلے 29 یا 30 سال کی عمر کی لڑکی بھی فرض کی جائے تو پندرہ سال بعد اس کی عمر 44 یا 45 سال ہی رہی ہوگی۔ اس عمر کی عورت کی مصنفہ نے جو چہرے، آواز اور مزاج کی تصویر کھینچی ہے وہ غیر فطری محسوس ہوتی ہے کیونکہ یہ Biologicaly ثابت ہے کہ جب تک عورت کا تولیدی نظام قائم رہتا ہے تب تک اس کے ظاہر اور باطن میں کوئی بڑی تبدیلی محسوس نہیں ہوتی ہے۔ سائنسی تحقیق اور تجربے کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ایک صحت مند عورت میں اوسطاً 50 کی عمر تک پیداواری صلاحیت قائم رہتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ افسانہ نگار اگر اس خاتون کردار کو افسانے کے پہلے حصے میں 39 یا 40 سال کی عورت کے روپ میں پیش کرتیں تو 15 سال بعد اس کو ادھیڑ عمر کی عورت بتانا قابل فہم تھا۔

بہرحال اس افسانے میں قرۃ العین حیدر نے حیاتِ انسانی کی اس جہت کو فنی اور جمالیاتی دروبست کے ساتھ آشکار کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے جو غیر معمولی اہمیت کی حامل ہوتے ہوئے بھی عام انسان کی نظروں سے اوجھل ہے۔ واحد غالب راوی کی تکنیک میں لکھے گئے اس افسانے کا

اسلوب قدرے آسان ہے جو قرۃ العین حیدر کے بقیہ فن پاروں کے اسالیبِ بیان سے ایک فاصلہ قائم کیے ہوئے ہے۔ ویسے بھی قرۃ العین حیدر کے یہاں بعض مقامات پر انگریزی الفاظ کا استعمال بھی روانی کے ساتھ ہوا ہے جن کے اردو متبادلات موجود بھی ہیں اور مستعمل بھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عینی کا تعلق ایک ارسٹو Aristocrat طبقے سے رہا ہے اور وہاں کی بول چال کہیں شعوری اور کہیں غیر شعوری طور پر ان کی تخلیقات میں در آئی ہے لیکن اس سب کے باوجود زیر تجزیہ افسانہ ''فوٹو گرافر'' کی زبان سلجھی ہوئی اور ہر کردار اپنی نفسیات اور شخصی معیار و مقام کے اعتبار سے گفتگو کرتا نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں کرداروں کی تعمیر و تشکیل اور ارتقا افسانہ نگار کے فن پر دسترس کے مظہر ہیں۔ نوجوان اور رقاصہ عمر کے ایک خاص حصے میں گیسٹ ہاؤس میں قیام پذیر ہوتے ہیں تاہم ہر جگہ یہ کردار اپنی شناخت اپنی زبان اور رکھ رکھاؤ سے انصاف کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ افسانے میں ابتدا اور وسط کے ساتھ ساتھ اختتام بھی ہے۔

المختصر یہ کہ یہ افسانہ کچھ غیر فطری پیشکش کے باوجود ایک عمدہ اور پر کشش افسانہ ہے جسے اردو افسانوں کے انتخاب میں بھی شامل کیا گیا ہے۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

(نظم ''جوابِ خضر''، مشمولہ: بانگِ درا)

□□□

Dr. Nusrat Jabeen
Dept. of Urdu
Markazi Jamia Kashmir
Gandarbal-191201 (J & K)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

E-mail:magazines@ncpul.in, 011-26108159:فیکس 011-26109746:فون

دستخط

شکیلہ نگار

جلتے پروں سے اڑان
ایک جائزہ

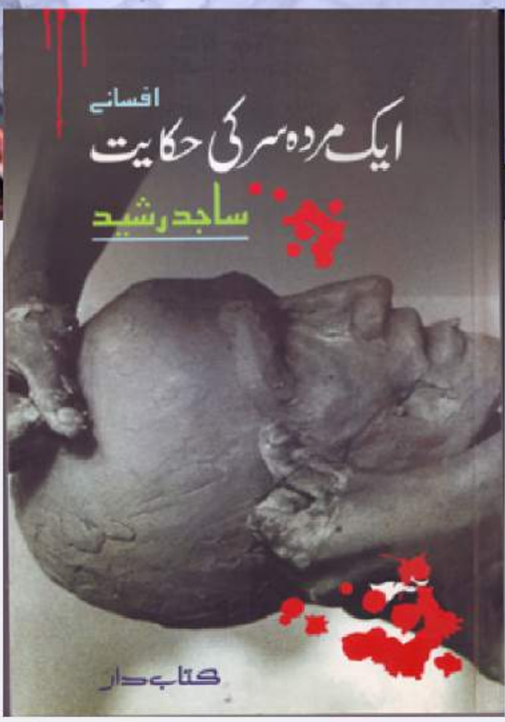

افسانہ 'جلتے پروں سے اڑان' ساجد رشید کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ یہ پانچ صفحے کا ایک مختصر افسانہ ہے، مگر موضوع کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ افسانے کا اہم کردار ایک پرندہ ہے۔ افسانے کا موضوع اچھوتا ہے۔ یوں تو جانوروں اور پرندوں کو کردار کے طور پر مختلف تخلیقات میں پیش کیا گیا ہے۔ جانوروں اور چرند پرند کے وسیلے سے انسانی اعمال و افعال پر تبصرے کی روایت ہندوستانی ادب میں زمانۂ قدیم سے رہی ہے۔ اردو میں بھی اس روایت کو برتا گیا ہے۔ 'کدم راؤ پدم راؤ' 'خاور نامہ' 'فسانۂ عجائب' وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان تخلیقات میں جانوروں کا استعمال تمثیل کے طور پر ہوا ہے اور ان کی زبان سے نصیحت آمیز باتیں کہلوائی گئی ہیں مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ ساجد رشید نے افسانے میں پرندے کو کردار ضرور بنایا ہے لیکن ان کا استعمال تمثیل کے طور پر نہیں کیا ہے، نہ ہی پرندے کے ذریعہ انسانی اعمال و افعال پر تبصرے کیے ہیں۔ یہاں افسانہ نگار نے جدت پسندی سے کام لیتے ہوئے موجودہ عہد کے ایک سنگین مسئلے کو افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ بہترین انسانی دماغ کے استعمال سے جو نت نئے سائنسی ایجادات و انکشافات ہو رہے ہیں ان کے مضر اثرات کس طرح سے چرند و پرند پر مرتب ہو رہے ہیں یہی اس افسانے کا موضوع ہے، جسے افسانہ نگار نے بڑی کامیابی سے پرندے کے توسط سے منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے اور ایک بے زبان کو قوت گویائی عطا کر دی ہے۔

زیر نظر افسانہ ساجد رشید کی گہری بصیرت کا غماز ہے۔ انھیں عصر حاضر کا بہتر شعور ہے اور ماحول پر ان کی گہری نظر ہے۔ سائنس اور ٹکنولوجی کی دن دونی رات چوگنی ترقی نے انسانی زندگی کے لیے مختلف سہولیات فراہم کرائی ہیں۔ جن کا ذکر بڑے زور و شور سے ہوتا ہے، مگر یہ حقیقت کا محض ایک رخ ہے۔ ان ایجادات و انکشافات نے ہماری زندگی کو آسانیاں فراہم کی ہیں وہیں نئے نئے مسائل کو بھی جنم دیا ہے۔ ماہرین ماحولیات (Enviornmentalist) گاہے گاہے اس جانب توجہ دلاتے رہے ہیں، مگر ہم ترقی کی دوڑ میں اس قدر اندھے ہو گئے ہیں کہ ایک لمحے کے لیے بھی ٹھہر کر غور کرنا گوارہ نہیں کرتے۔

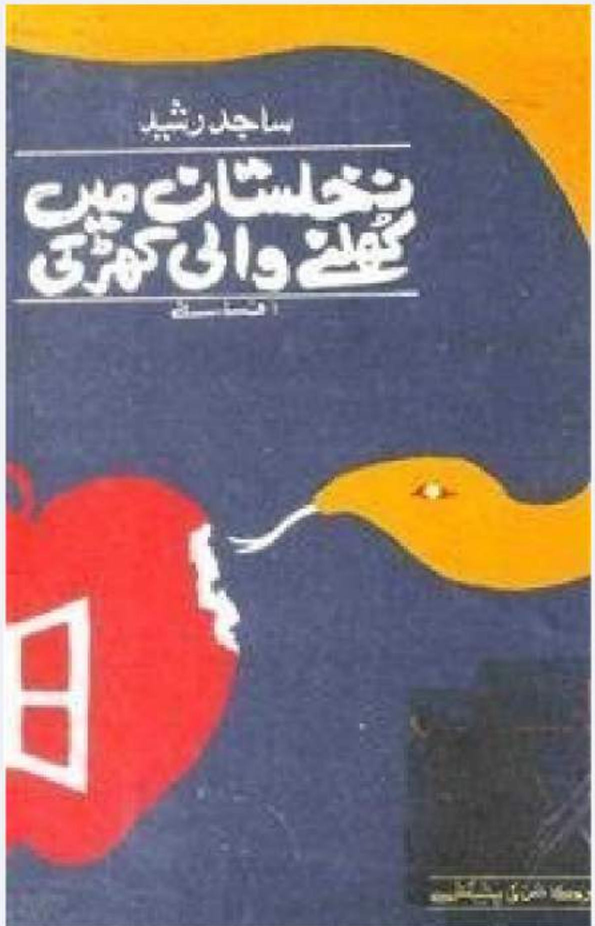

ایک بات تو واضح ہے کہ فطرت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے برے نتائج دیر یا سویر ظاہر ہوتے ہیں۔سائنسی ایجادات جہاں ایک طرف خوبیوں سے پر ہوتی ہیں وہیں ان میں خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ٹیکنالوجی کا استعمال جب حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو اس کے مضر اثرات ظاہر ہونے لگتے ہیں، جو تمام جانداروں کے لیے یکساں طور پر نقصان دہ ہوتے ہیں۔ساجد رشید نے اس افسانے میں ہمارے آس پاس کے ماحول میں پرواز کرنے والے چرندو پرند پر جدید سائنس وٹیکنالوجی کے جو منفی اثرات مرتب ہور ہے ہیں اس کو واضح کیا ہے۔

ریشم جیسے نرم ملائم اور رنگین پروں والا پرندہ اپنی سرخ چونچ کھول کر صبح کی فرحت بخش ہوا کو اپنے سینے میں بھر کر تازگی محسوس کرتا ہے۔ پھر وہ ماحول کا جائزہ لیتا ہے۔سورج کی نارنگی کرنیں تیزی سے پھیل رہی ہیں۔ آسمان سے باتیں کرتی پہاڑیاں ہیں۔اچھلتی کودتی ندی ہے۔ ہر پل آگے کی جانب رواں دواں جھرنا ہے۔ دور دور تک پھیلی مخملی گھاس کا سبزہ ہے۔ان پر جھلملاتی اوس کی بوندیں ہیں۔خودرو پودے ہیں۔ان پودوں پر منڈلاتی تتلیاں ہیں۔سبز پتوں سے ڈھکا گھنا جنگل ہے۔پیڑوں کی شاخوں پر پھدکتی چڑیاں ہیں۔اٹکھیلیاں کرتے ہوئے ہرنوں کا جھنڈ ہے۔

یہ دلکش منظر اس کے دل میں اڑان کی لہر بھر دیتا ہے اور وہ اپنے پروں کو پھڑ پھڑا کر اڑ جاتا ہے۔جب سورج ٹھیک اس کے سر پر آجاتا ہے تو وہ نیچے اتر کر دانہ چگتا ہے، ندی کا شیتل جل پیتا ہے اور تازہ دم ہو کر ہوا کو چیرتا ہوا فضا میں اڑتا چلا جاتا ہے۔اب اس کے دل میں آسمان کو چومنے کی خواہش انگڑائی لینے لگتی ہے۔جس رفتار سے وہ اوپر اٹھتا ہے اسی رفتار سے آسمان بھی اوپر اور اوپر اٹھتا چلا جاتا ہے آخر تھک کر پرندہ آسمان کو چومنے کا فیصلہ کل پر ملتوی کر دیتا ہے اور وہ نیچے اترنے لگتا ہے۔

نیچے کا نظارہ دیکھ کر پرندہ ایک دم سے بوکھلا جاتا ہے۔اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔نیچے چاروں طرف سیاہی مائل دھند پھیلی تھی۔اس دھند میں پیڑ، پودے، ندی۔ نالے، پہاڑ، جھرنے نہ جانے سب کہاں کھو گئے تھے۔ایک لمحے کے لیے تو اسے سویرے کی دھند کا گمان ہوتا ہے، مگر اس دھند میں نہ تو وہ خنکی تھی اور نہ ہی وہ تازگی۔ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں جھنجناہٹ ہونے لگتی ہے، سینے میں جلن ہوتی ہے اور حلق میں چیونٹیاں کاٹنے لگتی ہیں۔بازو ایسے شل ہو جاتے ہیں جیسے اسے جاڑا مار گیا ہو لہٰذا وہ پیڑ کی کسی شاخ پر اترنے کے لیے تڑپ اٹھتا ہے۔تھکن سے بوجھل آنکھوں سے جب وہ شاخ کی تلاش میں چاروں جانب نظریں دوڑاتا ہے تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی جاتی ہیں۔تاحد نظر جنگل، پہاڑوں اور ندیوں کی جگہ آسمان سے سر ٹکراتی سیسہ پلائی سے عمارتیں تھیں۔سینکڑوں ایکڑ میں پھیلی اسلحہ ساز فیکٹریاں تھیں۔ بڑے بڑے راڈار تھے۔ دیو پیکر ایٹمی تجربہ گاہیں تھیں۔سینہ تانے ٹی.وی ٹاور کھڑے تھے۔بڑی بڑی دوربینیں تھیں جن میں ماہرین فلکیات کی آنکھیں گڑی رہتی ہیں۔ برقی تاروں کا ایک جال تھا اور ایک کنارے پر ترتیب سے بنی ایٹمی بھٹیاں تھیں جن کی کشادہ چمنیوں سے نکلتا زہریلا دھواں پورے فضا کو آلودہ کر رہا تھا۔

پرندہ گھبرا کر جلد از جلد اپنے گھونسلے میں لوٹ جانا چاہتا ہے۔تھکن سے ٹوٹتے پروں سے وہ جیسے ہی تھوڑا نیچے اترتا ہے فضا میں دوڑتے مواصلاتی پیغامات اس کے پروں سے الجھ الجھ کر اس کی پرواز میں رکاوٹ پیدا کرنے لگتے ہیں۔اس نے نیچے کی طرف دیکھا کہیں کوئی شاخ، کوئی سبزہ نہ تھا اور اسے ہر حال میں نیچے اترنا تھا مگر کہاں؟ ساجد رشید نے اس لمحے میں پرندے کی اضطراری کیفیت کو بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے اقتباس دیکھیے:

''اس نے نیچے دیکھا سب کچھ وہی بدلا ہوا منظر تھا۔

ٹی.وی ٹاور تھا جو غیر مرئی مناظر کو منتشر کر رہا تھا..... یہاں بھی نہیں!
بڑے بڑے نیون سائن بورڈ ٹنگے ہوئے تھے...... یہاں بھی نہیں!
سیمنٹ کنکریٹ کے اسکائی اسکریپر منہ چڑھا رہے تھے...... یہاں بھی نہیں!
اسلحہ ساز فیکٹریوں کی دھواں اگلتی چمنیاں تھیں....... یہاں بھی نہیں!
دیو پیکر دوربینیں تھیں جو کائنات کے سارے اسرار سے واقف تھیں.... یہاں بھی نہیں!
بڑی بڑی ایٹمی بھٹیاں تھیں جو آگ اور زہر اگل رہی تھیں.....نہیں یہاں بھی نہیں!''

(ساجد رشید مجموعہ ایک مردہ سر کی حکایت، ممبئی: کتاب دار،ص138)

خوف و دہشت سے گھبرا کر پرندہ کسی پیڑ کی شاخ کو پانے کے لیے بے اختیار اپنے پروں کو پھڑ پھڑانے لگتا ہے اور ایک دیو پیکر عمارت کی کھڑکی کے مضبوط شیشے سے جا ٹکراتا ہے اور پھر ایٹمی بھٹی کے عین منہ پر اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے۔توازن کا کھونا تھا کہ آگ اس کے پروں کے ساتھ ساتھ پورے وجود کو جلانے لگتی ہے۔یہاں پہنچ کر ساجد رشید نے محض ایک جملے میں پرندے کی آخری پرواز کا جو اذیت ناک نقشہ کھینچا ہے اس سے افسانے کے موضوع پر بھر پور روشنی پڑتی ہے، ملاحظہ ہو:

''پرندے نے تڑپ کر نیچے اگتے لوہے، آگ اور دھول کے جنگل پر آخری نگاہ ڈال کر سوچا کیا یہ میری آخری پرواز ہے؟''

(ساجد رشید، مجموعہ ایک مردہ سر کی حکایت، ممبئی: کتاب دار،ص 139)

آج ہمارے کانوں سے چڑیوں کی چہچہاہٹ، کوئل کی کوک، کوّے کی کائیں کائیں اور بھونرے کی گنگناہٹ دور ہوتی جا رہی ہے۔ اب ہمارے گھروں کے آنگنوں میں گوریے پھدکتے ہوئے نہیں ملتے۔ آخر یہ سب کہاں چلے گئے؟ پرندے اب کیوں نہیں آتے؟ روشن دانوں میں گھونسلے کیوں نہیں بناتے؟ مذکورہ اقتباس میں ایسے ہی سوالوں کے جواب دیے گئے ہیں۔ہم نے ترقی کے نام پر ہرے بھرے جنگلوں کو تہس نہس کر کے ہر طرف سیمنٹ اور کنکریٹ کے جنگل اگا دیے ہیں، جن سے ٹکرا کر نرم و نازک پروں والے پرندے اپنی جانیں گنوا بیٹھتے ہیں۔ جا بجا دوڑتی مواصلاتی رو پرندوں کی پرواز میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔ ان

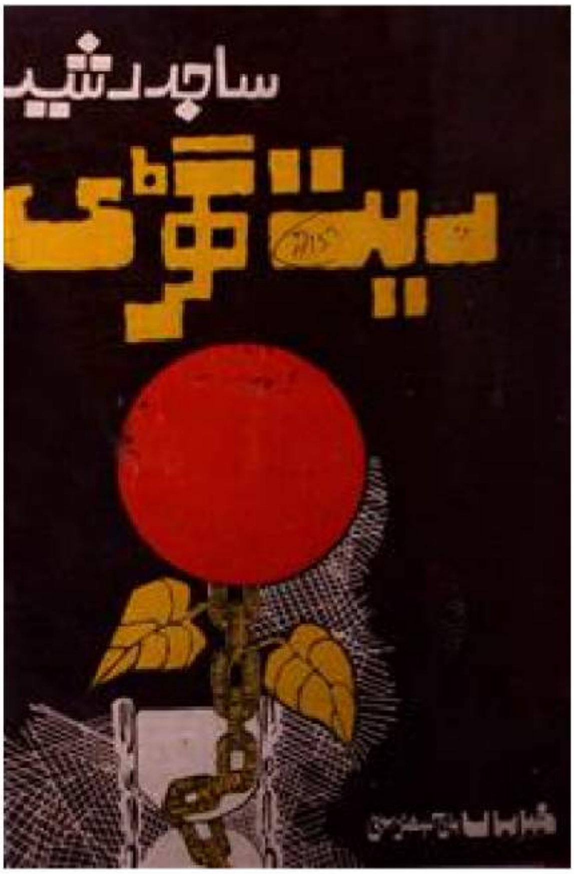

حالات میں بھلا پرندے آئیں بھی تو کیسے؟ افسانے کا آخری اقتباس ان ماہرین فلکیات پر زبردست طنز ہے جن کی کرم فرمائیوں سے نہ صرف پرندوں کی پرواز میں خلل پڑتا ہے بلکہ رفتہ رفتہ ان کی بہت ساری نسلوں کا خاتمہ بھی ہوتا جا رہا ہے:

''وہ سارے ماہرین فلکیات جن کی آنکھیں بڑی بڑی دوربینوں میں گڑی رہتی ہیں اور جو کائنات میں نمودار ہونے والے ایک ایک ستارے کی خبر رکھتے ہیں وہ عین اپنے سر پر ایک پرندے کے وجود کے خاک ہو کر فضا میں بکھرنے کے حادثے سے لاعلم رہے!!''

(ساجد رشید، مجموعہ ایک مردہ سر کی حکایت، ممبئی: کتاب دار،ص)

□□□

Shakila Nigar
S.M.S. G College
Sherghati
Gaya-824211 (Bihar)

ڈاکٹر اُویس احمد

آمنہ ابوالحسن کا افسانہ 'کاش'

تفہیم و تنقید

افسانہ ''کاش'' ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو مرگی یعنی اِپیلس پائی کے مرض میں مبتلا ہوتی ہے۔ مرگی ایک ایسا مرض ہے جس میں انسان کا اعصابی نظام نہایت ہی کمزور ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے بے قاعدہ دورے پڑتے ہیں۔ ویسے افسانہ نگار نے منفرد موضوع کا انتخاب کیا ہے؛ لیکن عورت کے انتخاب نے اس کی موضوعاتی حیثیت کو مزید مستحکم بنایا ہے۔ افسانہ نگار نے مرگی کے مرض میں مبتلا ایک پندرہ سالہ لڑکی کے ساتھ پیش آنے والی دشواریوں کے ساتھ ساتھ افراد خانہ کی ذہنی کیفیات نیز اس مرض کے تئیں معاشرے کے رویے کو بھی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ زرین نام کی لڑکی مرگی کے مرض میں مبتلا ہوتی ہے۔ جس کی دیکھ بھال اُس کی بڑی بہن زیبا کرتی ہے۔ زیبا چوں کہ پڑھائی مکمل کرکے اپنا مستقبل روشن دیکھنا چاہتی ہے؛ لیکن ایک حادثے میں اُن کی والدہ کا انتقال ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے زرین کی دیکھ بھال کی پوری ذمہ داری زیبا کے کندھوں پر آجاتی ہے۔ زیبا مستقبل کے ساتھ ساتھ اپنی پوری زندگی زرین کے لیے وقف کردیتی ہے اور وہ پوری زندگی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیتی ہے لیکن اپنی دوسری بہن زیرک کو پڑھا کر وہ تمام خواب دیکھتی ہے جو اُس نے کسی زمانے میں اپنے لیے دیکھے ہوتے ہیں۔ زیبا اپنی زندگی کی تمام شمعیں بجھا دیتی ہے تا کہ زرین کی زندگی کی شمعیں روشن ہوں۔ لہٰذا وہ زرین کی دیکھ بھال میں تمام تر دُشواریوں کو برداشت کرلیتی ہے۔ زیبا ماں بن کر زرین کی تمام تکالیف کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیتی ہے؛ کیونکہ اُس کا ماننا ہے کہ اگر زرین کی ماں زندہ ہوتی تو وہ بھی اپنی زندگی زرین کے لیے وقف کردیتی۔ لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ زیبا بھی ایک عورت ہے؛ اُس کے بھی جذبات و احساسات ہیں، اُس کی بھی خواہشات ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اُس کی خواہشات سمندر کی موجوں کی طرح ٹھاٹھیں نہیں مارتی ہیں، ایسا نہیں ہے کہ اُسے کسی ہم سفر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ تنہائی اور غم میں اُسے کسی ہم درد کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تنہائی کے دوران اپنے آپ سے سوال کرتی ہے:

''اپنی طرف توجہ دو زیبا۔ تمھیں ایک رفیق کی ضرورت ہے
کسی اچھے انسان کی جو تمھاری اندرونی تنہائی کا مداوا بن
جائے۔''

لیکن اندر سے ایک لاچار، مجبور اور ذمہ داریوں میں بندھی ہوئی عورت کا جواب کچھ یوں آتا ہے:

''میں ایک ایسی کتاب ہوں جس کا زیادہ حصہ کھلا ہوا، عیاں

ہے، سب پر ظاہر ہے لیکن اس کتاب کا ایک مخفی حصہ ایسا بھی ہے جو صرف اس کی ذات اس کی آگہی تک محدود و مخصوص ہے جس کی بابت دوسرا کوئی کچھ نہیں جانتا۔

کھلے عیاں حصے میں اس کی ہنسی مسکراہٹیں اس کے ارادے اور عزائم ہیں، مگر مخفی حصے میں درد و کرب ہے، وہ آنسو پوشیدہ ہیں جن کا کوئی حصے دار نہیں۔"

زیبا جان بوجھ کر اپنی زندگی کو ایک ایسے پردے میں رکھنا چاہتی ہے جس کے آر پار کوئی نہ دیکھ سکے، جس کا اندرون کوئی نہ جان سکے، جس کی کیفیاتِ دروں کو کوئی محسوس نہ کر سکے۔ وہ نہیں چاہتی ہے کہ کوئی اُس کے نہاں خانے سے واقف ہو جائے اور سمجھا بجھا کر اُس کے عزائم کو پست کرنے کی کوشش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تنہائی، درد و کرب اور غم میں کسی کو شریک نہیں ٹھہراتی ہے؛ کیوں کہ وہ غم و اندوہ کی اوڑھی ہوئی چادر کو اُتار پھینکنا نہیں چاہتی ہے۔ اسی لیے وہ چاہتی ہے کہ لوگ اُس کی زندگی کے اُس حصے پر ارتکاز کریں جس میں مسکراہٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اس لیے کہ جب تک لوگ اُس کی مسکراہٹوں میں محو تماشا ہوں گے تب تک اُس کے نہاں خانے کی دل خراش صدائیں لوگوں کو سنائی نہ دیں گی۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ وہ اپنی زندگی کے نہاں خانے سے کسے واقف کراتی۔ والد، جو اپنے دوست احباب اور زندگی کی تمام شادمانیوں سے گویا اپنا رشتہ منقطع کر کے گھر کے اخراجات پورا کرنے کے لیے دفتر میں ایک مشین کی طرح کام کرتے ہیں۔ جنھیں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے خیال سے بھی ڈر لگتا ہے کہ گھر کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ دوسری طرف زرین جسے ایک ایسے مرض نے جکڑ رکھا ہے کہ دھیان ہٹ جانے پر وہ موت کی آغوش میں جا سکتی ہے۔ تیسری طرف چھوٹی بہن جسے زیبا وہ سب کچھ دینا چاہتی ہے جو اُس نے اپنے لیے سوچا ہوتا ہے۔

افسانے کا پلاٹ بہ ظاہر سادہ معلوم ہوتا ہے؛ لیکن کئی جگہوں پر کچھ اجزا غیر ضروری اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے پلاٹ کے منطقی تسلسل میں رخنہ پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ذکی زرین کی ذہنی معذوری کے دوران درپیش مشکلات کے حوالے سے پہلے بوا یعنی خادمہ اور اُس کے بعد دوسری کڑی کے طور آنٹی یعنی پڑوسن سے دوبارہ زرین کی دماغی حالت، دورہ پڑنے کے دوران اُس کی دشواریوں کو دریافت کر لیتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ افسانہ نگار نے دو مختلف جگہوں پر زرین کی ذہنی بیماری اور اُس سے پیدا شدہ اُلجھنوں اور دشواریوں کے ساتھ ساتھ افرادِ خانہ کی ذہنی کیفیات کو بیان کیا ہے۔ بوا کا حصہ پلاٹ کے منطقی تسلسل کے لیے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پلاٹ میں آغاز، ارتقا اور انجام کا خیال رکھا گیا ہے جس سے قاری کو بھی اُکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی ہے۔

افسانہ نگار نے نہ صرف زرین کی ذہنی بیماری اور اُس سے جڑے مسائل کو بیان کیا ہے بلکہ گھر کے بقیہ افراد کی ذہنی کیفیات کا بھی اظہار کیا ہے، نیز اس بیماری کے تئیں دوسرے لوگوں کے رویے کا بھی اظہار کیا ہے۔ افسانہ نگار نے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ وہ مذکورہ بیماری کے تعلق سے بنیادی جانکاری بھی فراہم کرے جس میں وہ کامیاب ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس ضمن میں اُنھوں نے مرگی کے مرض میں مبتلا انسان کی علامات کے ساتھ ساتھ اس کی جسمانی اور نفسیاتی اُلجھنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بیماری سے نپٹنے کے لیے معالجاتی سائنس کی بے بسی کی طرف بھی واضح اشارہ کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اسکولوں میں اس طرح کے مرض میں مبتلا بچوں کے ساتھ ناروا سلوک پر بھی تشویش کا اظہار کیا ہے۔

افسانہ نگار نے مرگی کے مرض کے ساتھ ساتھ بچوں کی ٹریفکنگ کے بڑھتے رجحان کی طرف بھی واضح اشارہ کیا ہے۔ جب زرین کو بازار میں مرگی کا دورہ پڑتا ہے اور زیبا اُسے گھر لے جانے کی کوشش کرتی ہے؛ لیکن زرین کے چیخنے اور چلانے سے ایک مجمع اکٹھا ہو جاتا ہے۔ جنھیں زیبا پر زرین کو اغوا کرنے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ بچوں کے اغوا ہونے کے واقعات اس سے پہلے بھی رونما ہوئے ہیں، جس سے بچوں کی ٹریفکنگ کے بڑھتے رجحان کی طرف انگشت نمائی ہوتی ہے:

"۔۔۔وہ سچویشن ہی ایسی تھی کہ میں کیا ہر کوئی سٹپٹا جاتا، کیوں کہ بچوں اور لڑکیوں کا اغوا روزمرہ کا معمول جو بن گیا ہے آج کل۔ ضمیر فروشوں کے لیے ایک منفعت بخش د ھندہ۔"

دوسری طرف افسانہ نگار لوگوں کی ذہنیت پر بھی سوالیہ نشان لگاتی ہیں کہ کس طرح لوگ حقیقت تک پہنچنے کے بجائے نتائج پر جست لگا کر براہ راست مگر خود ساختہ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ جس کی طرف افسانہ نگار یوں اشارہ کرتی ہے:

"تھوڑی دیر تو بالکل ٹھیک رہی وہ (زرین)، مگر پھر رو رو کر مجمع اکٹھا کر لیا۔ تماشہ بنا کر رکھ دیا میرا اور مجمع کی مین ٹے لیٹی تو آپ جانتی ہی ہیں۔"

افسانہ نگار نے مرگی کے مرض میں مبتلا زرین کی حرکات و سکنات، اُس کے رویوں اور جسمانی اور نفسیاتی باریکیوں کو جس انداز سے بیان کیا

ہے؛ اُس سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے اس بیماری میں مبتلا انسان کو نہایت ہی قریب سے دیکھا اور مشاہدہ کیا ہے۔ افسانہ نگار نے زرین کے غیر معمولی نفسیاتی رویے کی باریکیوں کو بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر زرین کئی دنوں تک ایک ہی گیت سنتی ہے جس سے اُس کی طبیعت میں کوئی اُکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی اُس کی اجازت کے بغیر اُس کے پسند کے گانے کو بند کر دے تو اُس پر برس پڑتی ہے۔ کبھی کمرے میں رکھے ہوئے مختلف رسائل کی تصاویر دیکھتی ہے تو کبھی البم کی متنوع تصاویر کو تکتی رہتی ہے۔ اس ضمن میں زرین رنگین تصاویر والے میگزین اور مختلف قسم کے کھلونوں میں بھی غیر معمولی دلچسپی لیتی ہے۔ حالاں کہ اس طرح کا مریض اگر چہ ظاہری طور بالکل ٹھیک دکھائی دیتا ہے لیکن دورہ پڑنے پر ہی اُس کی اصل صورت حال کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زرین بھی پہلی نظر میں بالکل ٹھیک دکھائی دیتی ہے۔:

”گول مٹول، گدگدی، گندمی رنگت اور مہتابی چہرے والی زرین جس کے سادہ سے نقوش میں بھی ایک نظر نواز جاذبیت اور کشش تھی۔۔۔ اگر چہ زرین کی ناک چھوٹی سی تھی، آنکھیں بھی چھوٹی چھوٹی لیکن مختصر تراشا ہوا دہانہ خاصہ مقناطیسی تھا۔ ابرو خم دار۔ چہرے کا ٹوٹل امپریشن بے حد معصوم۔۔۔ سی گرین کلر کے لباس میں اس کا گندمی رنگ اور نکھر آیا تھا جیسے شاداب شاخ کا کوئی تازہ پتہ ہو۔ کلائیوں میں بھی میچنگ چوڑیاں کھنک رہی تھیں اور نفاست سے گندھی ہوئی اس کی دونوں چوٹیاں اس کے سر کی ہر جنبش پر ادھر ادھر ڈولنے لگتی تھیں۔ غرضیکہ اس کے تمام سراپے میں مٹھاس ہی مٹھاس تھی۔“

لیکن جب زرین کو دورہ پڑتا ہے تو اس کی حالت کچھ یوں ہو جاتی ہے۔:

”۔۔۔ زیبا اور بوا نے آ کر فوراً زرین کو سنبھالا اور بہ دقت اُسے اٹھا کر بٹھلا دیا اور ذکی یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ زرین کا نرم و گداز بدن اعصابی تشنج کی وجہ سے اکڑ کر لکڑی کی طرح سخت ہو گیا تھا۔ حالت سکون میں ستاروں کی طرح دمکنے والی اس کی روشن روشن آنکھیں حالت فٹ میں اوپر کی طرف چڑھ کر ساکت ہو گئی تھیں۔ لب بھنچ گئے تھے جس کی وجہ سے اس کا پر کشش دہانہ اعصابی کھچاؤ کے باعث بالکل ٹیڑھا ہو گیا تھا اور لبوں کی شہابی رنگت بتدریج نیلاہٹ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس کے معصوم چہرے کی تمام ساخت یکسر بدل کر رہ گئی تھی اور وہ بے توازن ہو کر شدت سے مٹھیاں جکڑ رہی تھی اور ادھر ادھر ہاتھ پاؤں پھینک رہی تھی۔“

مذکورہ بالا اقتباس اگر چہ منظر نگاری کی عمدہ مثال قرار دیا جا سکتا ہے ؛ لیکن زرین کو دورہ پڑنے کے جزئیات کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے ، وہ افسانہ نگار کی فنی گرفت پر دال ہے۔ دوسری بات یہ کہ افسانہ نگار نے تمام جزئیات کا احاطہ کرتے ہوئے دورہ پڑنے پر مرگی کے مرض سے متعلق بنیادی جانکاری بھی فراہم کر دی ہے جو افسانے کے معلوماتی زاویے کو ظاہر کرتی ہے ؛ جس کے تحت مرگی کے مرض سے متعلق معلوماتی عناصر کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس بات کو افسانہ نگار نے مدنظر رکھ کر زرین کے سراپے کو بہترین پیرائے میں بیان کیا ہے۔

افسانہ نگار نے زرین کی ظاہری صورت حال کے خد و خال کو بیان کر کے اُس کی معصومیت کے پیچھے دراصل اُس جسمانی بے اعتدالی کو ظاہر کیا ہے جو اُس کی پُر سکونیت کو وحشت ناکی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ افسانہ نگار دراصل اب بات کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتی ہیں کہ مرگی کا مریض اگر چہ بہ ظاہر معصوم اور سراپے سے بالکل بہتر معلوم ہوتا ہے لیکن اُس کی معصومیت اور سراپے کا مٹھاس پن کو دورہ پڑنے پر بگڑنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی ہے۔ کیوں کہ یہ بیماری کچھ ایسی ہے کہ انسانی ذہن کے بول چال کا حصہ فالج زدہ ہوتا ہے، بھلے ہی مریض بول نہیں سکتا لیکن اشاروں میں باتیں بول اور سمجھ سکتا ہے۔ دراصل افسانہ نگار اس بات پر ارتکاز کرانا چاہتی ہیں کہ زرین جیسی مریضہ کی دیکھ بھال میں کتنا چوکنا رہنا پڑتا ہے؛ اگر ذرا بھی دھیان اس برح کے مریض سے ہٹ جائے تو اُس کی جان بھی جا سکتی ہے۔ دورہ پڑنے پر زرین کی حالت کچھ یوں ہو جاتی ہے۔:

”۔۔۔ عام حالت میں تو وہ تعاون کر لیتی ہے لیکن اگر موڈ بگڑا ہوا ہو تو کسی کی نہیں مانتی اور جب فٹ پڑتا ہے تب تو اللہ اللہ۔ اس کی منگل ویووز اتنی منتشر ہو جاتی ہیں کہ اس کیفیت میں بالکل بپھری ہوئی شیرنی بن جاتی ہے، تب نہ زیبا کو پہچان سکتی ہے نہ اپنے والد کو نہ بوا کو نہ ہی مجھے۔ تب اس کی وحشت سنبھالی نہیں سنبھلتی۔“

”مار پیٹ نوچ کھسوٹ شروع کر دیتی ہے۔ سامان کو اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگتی ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ محلے بھر میں اس کی چیخیں گونجنے لگتی ہیں۔“ ۔۔۔ جب کسی طرح نہیں سنبھلتی تو جھلا کر مار بھی دیتی ہے زیبا اسے۔“

افسانہ نگار نے زرین کی دونوں حالتوں کو بیان کیا ہے۔ایک نظر میں زرین بالکل شاداب اور معصوم دکھائی دیتی ہے لیکن وہیں دوسری طرف دورہ پڑنے پر اُس کی معصومیت پر موت کا سایہ منڈلا رہا ہوتا ہے۔کئی بار وہ دورہ پڑنے پر موت کی آغوش میں چلے جانے سے رہ گئی ہے۔مثال کے طور پر اُس کی پیشانی پر دورہ پڑتے ہی زمین پر اوندھے منہ گرنے کی وجہ سے چوٹیں آئی ہیں، جن کے نشان واضح طور اُس کی پیشانی پر دکھائی دیتے ہیں۔افسانے کا ایک پڑاؤ ایسا بھی ہے جہاں زیبا ذکی کو زرین کی بیماری کے بارے میں پوری جانکاری فراہم کرتی ہے۔مثال کے طور اس طرح کے مریض کو نفسیاتی معالج کی ضرورت پڑتی ہے، بعض اوقات اس طرح کے مریضوں کے دماغ کا بڑا آپریشن بھی کیا جاتا ہے، اُس کے بعد مریض یا تو نارمل ہو جاتا ہے یا دورے پڑنے میں بہت حد تک کمی آجاتی ہے اور دوائیاں پابندی سے مریض کو دینا پڑتی ہیں خاص کر ٹرنکولائی زر وغیرہ۔افسانہ نگار نے زرین کی نفسیاتی اور معالجاتی سائنس کی سطح پر زرین کے حوالے سے پوری جانکاری فراہم کی ہے۔یعنی اس بیماری کے تعلق سے افسانہ نگار نے دو پہلوؤں کو ملحوظ نظر رکھا ہے۔ایک طرف دورہ پڑنے پر زرین کے نفسیاتی رویوں کو بیان کر کے زیبا جیسے افراد خانہ کی نفسیاتی اُلجھنوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔تو دوسری طرف معالجاتی سائنس کی بنیاد پر جانکاری فراہم کر کے اس بیماری کے تئیں معالجاتی سائنس کی صورت حال کو بیان کیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس طرح کی بیماری زیبا جیسے افراد خانہ کے ساتھ ساتھ معالجاتی سائنس کے لیے بھی کسی چیلنج سے کم نہیں ہے۔

افسانہ نگار نے ذہنی معذوری جیسی بیماری کے حتمی علاج کے لیے معالجاتی سائنس کی بے بسی کو بھی واضح کیا ہے اور اس بات کی طرف واضح اشارہ کیا ہے کہ معالجاتی سائنس اس بیماری کا مکمل علاج تلاشنے میں ناکام نظر آتی ہے۔اسی طرح ذہنی طور پر معذور بچوں کے لیے جو اسکول موجود ہیں اُن کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔وہاں پر اس طرح کے مریضوں کی دیکھ بھال اُس طریقے سے نہیں ہوتی ہے جس طرح ہونی چاہیے۔زرین جیسے بچے وہاں بے توجہی اور لاپرواہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔معالجاتی سائنس اور اسکولوں سے بے زاری کا اظہار افسانہ نگار نے یوں کیا ہے:

''۔۔۔ٹریجڈی یہ ہے کہ ہماری ترقی یافتہ میڈیکل سائنس ایسے ریٹارڈڈ بچوں کی صحت مندی کے سلسلے میں ہنوز بے بس ہے۔کوئی بھی ایسا حتمی علاج ہنوز دریافت نہیں ہو سکا جو ایسے بچوں کی ذہنی تندرستی مکمل طور پر سنبھال سکے۔اسکولوں کی حالت ابتر ہے جیسی دیکھ بھال اور تربیت وہاں ہونی چاہیے ہوتی نہیں۔بس رواداری میں سب کچھ ہوتا رہتا ہے لہذا بچوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا اور اُن کے لواحقین ہمیشہ غیر یقینی حالات کا عذاب بھگتتے رہنے پر مجبور ہیں۔''

اس طرح کی بیماری کے تئیں لوگوں کے رویے، میڈیکل سائنس کی ناکامی اور تو اور اسکولوں کی طرف سے برتنے والی بے توجہی اور لاپرواہی سے افسانہ نگار نے ایک ایسا نتیجہ اخذ کیا جس سے بہت حد تک حقیقت کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں:

''دنیا ان کے صحیح درد و کرب کا، مشکلات کا اندازہ کبھی نہیں کر سکتی صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود ایسے بچوں کا تجربہ رکھتے ہیں۔بقیہ صرف تماشائی ہوتے ہیں۔کوئی دیکھ کر ہنس پڑا۔کسی نے افسوس کر لیا۔بات ختم۔''

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ زرین جیسے مریضوں کے دُکھ درد اور مشکلات کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔لیکن اس حقیقت سے بھی آنکھیں نہیں چرائی جا سکتی ہیں کہ ہمارا رویہ زرین جیسے مریضوں کے لیے کسی بھی صورت میں اچھا نہیں ہوتا ہے۔اسے افسانے کا نقطہ نظر بھی سمجھ لینا چاہیے کہ افسانہ نگار دراصل زرین جیسے مریضوں کے تئیں ہماری بے توجہی اور منفی رویوں کو ظاہر کر کے یہ واضح کر دینا چاہتی ہیں کہ ہم اکثر ایسے مریضوں کو اپنی ہنسی مذاق کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ انسان دوسروں کے غموں اور مصیبتوں اور مشکل گھڑیوں سے تب تک بے توجہی کا اظہار کرتا ہے جب تک وہ خود کسی غم یا مصیبت سے ٹکرا نہیں جاتا ہے۔اُس سے قبل وہ محض ایک تماشائی بنا ہوا ہوتا ہے، دوسروں کی مصیبتوں سے یہ سوچ کر کنارہ کش ہو جاتا ہے کہ وہ خوش ہے، دوسروں کی تکلیفوں کو دیکھ کر یہ سوچ کے بھاگتا ہے کہ وہ بڑے آرام سے رہ رہا ہے، دوسروں کے غموں میں یہ سوچ کر شریک نہیں ہوتا ہے کہ وہ خوشی سے اپنی زندگی گزار رہا ہے۔حالاں کہ دیکھا جائے تو افسوس جتانے سے یا کسی کا ہمدرد بننے سے اُس کی تکلیفوں کو دور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ہاں البتہ اُس غم کی شدت کو بہت حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ زرین جیسے مریض کسی کی ہمدردی جتانے سے ٹھیک نہیں ہو سکتے ہیں؛ لیکن اُن کے تئیں ایک خوش گوار رویے سے کسی قدر نفسیاتی اُلجھنوں کو کم ضرور کیا جا سکتا ہے۔یہاں افسانہ نگار نے ایک نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ابھی تک مرگی کا مرض لاعلاج اس لیے ہے کہ لوگوں کو زرین جیسے مریضوں کی تکالیف کا ''احساس'' نہیں ہے۔دیکھا جائے تو معالجاتی سائنس کے تئیں اس طرح کا

استنباط سطحی بھی ہے اور یک رُخا بھی۔ انسانی رویوں کی بنیاد پر سائنس کے تیئں اس طرح کی فیصلہ سازی لایعنی بات معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ ایسی بھی بیماریوں کا علاج معالجاتی سائنس میں ممکن ہے جن سے عوام ابھی تک پوری طرح واقف بھی نہیں ہے۔ لہٰذا ہم احساس کو بنیاد بنا کر معالجاتی سائنس کو بے بس قرار نہیں دے سکتے ہیں۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ اسکولوں میں زرین جیسے بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت کا معقول انتظام ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یقیناً اسے اسکول انتظامیہ کے گہرے احساس کا فقدان تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس بات کو ہر ایک انسان پر منطبق نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مرگی جیسی بیماری کے تیئں ہر فرد میں ''احساس'' کا فقدان ہے۔ اس افسانے میں ذکی ایک ایسا کردار ہے جسے زرین اور زیبا دونوں کے تیئں گہرا احساس ہوتا ہے۔ وہ اکثر زرین کو دیکھنے اُن کے گھر آتا ہے؛ لیکن ذاتی مصروفیات کی وجہ سے کئی دن زرین کو دیکھنے نہیں آتا ہے۔:

''زیبا کچھ دنوں تک ذکی کے آمد کی متوقع رہی مگر جب وہ نہیں آیا تو اُسے بھی بھول بھال گئی۔''

یہاں دو الفاظ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔؛''متوقع'' اور ''بھول بھال''۔ سب سے پہلی بات یہ کہ زیبا ذکی سے اُمید کیوں رکھتی ہے۔ اگر وہ زرین اور خود کے درمیان کسی اور کو نہیں دیکھنا چاہتی ہے، پھر ذکی سے یہ توقع کیوں رکھتی ہے کہ وہ زرین کو دیکھنے آئے۔؟ بنیادی بات تو یہ ہے کہ زیبا بھی ایک عورت ہے، نا چاہتے ہوئے بھی اُسے ایک ہم سفر کی ضرورت ہے، جو اُس کی تنہائی کو دور کر سکے، جو اُس کے دُکھ درد کو سمجھ سکے، جو اُس کی زندگی کے مخفی گوشے کا حصہ دار بنے جو ابھی تک اُس کی ذات تک محدود ہے، جو اُس کے اُن آنسوؤں کو پونچھ سکے جو ابھی تک پوشیدہ ہیں۔ غالباً اسی پیش نظر زیبا ذکی سے اُمید بھی لگائے بیٹھی ہے؛ لیکن ذکی کے نہ آنے پر اُسے فوراً بھول بھی جاتی ہے۔ بھولنے کا جہاں تک سوال ہے، چوں کہ زیبا کو ایسے لوگوں کا تجربہ حاصل ہے جو اس بیماری کے تماشائی بنے ہوئے ہیں یا ہنسی مذاق اُڑاتے ہیں یا پھر رسمی طور اظہار افسوس کرتے ہیں۔ لیکن جب ذکی لگاتار زرین کی خیر وعافیت پوچھنے اُس کے گھر آتا جاتا رہتا ہے، تو افسانہ نگار کی اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ مرگی جیسی بیماری کے تیئں ہر کس وناکس کا رویہ قابل تشویش ہوتا ہے۔ ذکی نے زیبا کے اندیشے کو غلط ثابت کر کے اس بات کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ کسی بھی معاملے میں لوگوں کے تعلق سے بدظن یا بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ذکی جیسے خیر خواہ اور ہمدرد کو نہ صرف زرین کے تیئں گہرا احساس ہے بلکہ اُس کی اپنائیت میں خلوص بھی شامل ہے۔

افسانہ نگار نے زیبا کی صورت میں عورت کا ایک ایسا کردار گھڑ لیا ہے جو ایک طرف درد و کرب اور مشکلات کا ایک پہاڑ اپنے سر لیے ہوئی ہے اور دوسری طرف ایک چٹان کی طرح اپنے عزائم کے ساتھ زرین کے لیے اپنی پوری زندگی قربان کرنے پر مصر ہے۔ یعنی زیبا کا کردار ایک ایسی عورت کا ہے جو ہر حال میں مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنے والی ہے۔ وہ اپنے درد و کرب کا حل روتے بسورتے تلاش نہیں کرتی ہے بلکہ باعزم ہو کر زندگی کے ہر مشکل کھیل میں جیت کو اپنے نام کرنے والی عورت ہے۔ زیبا کا کردار ایسا ہے جو آنسو بہانے کو ناکامی اور پست ہمتی سے تعبیر کرتی ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اُس کے احساسات و جذبات کی لَو دھیمی پڑ چکی ہے یا اُسے جیون ساتھی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے، وہ اپنی تنہائی کا مداوا نہیں کرنا چاہتی ہے، وہ دُنیا کی رونقوں سے فیض یاب نہیں ہونا چاہتی ہے اور وہ اپنے دوست واحباب کے ساتھ وقت نہیں گزارنا چاہتی ہے۔:

''وہ یقیناً خوشی اور کچھ بے فکری محسوس کرتی ہوں گی کیوں کہ اس کی بھی کوئی زندگی ہے بیٹے۔ نہ کہیں آنے کی نہ جانے کی۔ نہ کوئی دوست سہیلی۔ بیشک کھانے اوڑھنے پہننے خرچ کرنے کی کوئی کمی یا تکلیف نہیں ہے اسے۔ مگر صرف یہی تو زندگی نہیں ہے۔ خود دیکھ لو کہ اس کے اطراف کتنی رونقیں پھیلی ہوئی ہیں۔ لوگ سیر وتفریح، سنیما، تھیٹر، دوست احباب کے ہاں جاتے آتے رہتے ہیں۔ پکنکیں مناتے ہیں لیکن زیبا ایسا کچھ نہیں کر سکتی۔ ایسی ساری مسرتیں کھرچ کر پھینک دی ہیں اس نے اپنی زندگی سے۔ مگر کیا درحقیقت اس کا دل نہ ترستا ہوگا ان کے لیے۔''

جب زیبا کا اندرون اُسے پوچھتا ہے کہ ''اپنی طرف توجہ دو زیبا۔ تمھیں ایک رفیق کی ضرورت ہے کسی اچھے انسان کی جو تمھاری اندرونی تنہائی کا مداوا بن جائے۔'' تو زیبا چیختی نہیں ہے، غم کے ساتھ ہی ڈوب نہیں جاتی ہے، مصیبتوں کے بوجھ تلے کچل نہیں جاتی ہے اور آنسو بہا کر کمزوری اور پست ہمتی کو غالب نہیں ہونے دیتی ہے۔ اُس نے اپنے مستقبل کے لیے روشن خواب تو ضرور دیکھے تھے لیکن زندگی نے ایسی کروٹ لی جس سے اُس کی زندگی تاریکی کی آغوش میں چلی گئی۔ لیکن اس کے باوجود بھی زیرک کی صورت میں ایک اُمید باقی ہے۔ جسے پڑھا لکھا کر زیبا کو اس بات کی خوشی ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب وہ زیرک کے روشن مستقبل کو دیکھ کر اپنی ضائع ہوئی جوانی کو یکسر بھول جائے گی۔

زبان و بیان کا جہاں تک تعلق ہے، افسانے کا اسلوب سادہ اور کسی حد تک شفاف ہے۔ نامانوس اور ثقیل الفاظ کا استعمال اگر چہ نہیں ہوا ہے؛ لیکن انگریزی لفظیات کی بھر مار ضرور ہے۔ انگریزی الفاظ کے استعمال سے اگر چہ کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ مذکورہ افسانے میں غیر مناسب جگہوں پر انگریزی الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اکثر انگریزی الفاظ ایسے ہیں جن کے اردو متبادلات نہ صرف موجود بلکہ مستعمل بھی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ افسانہ نگار کو انگریزی لفظیات سے نہ صرف شناسائی ہے بلکہ تخلیقی سطح پر اُس لفظیات کے استعمال پر بھی گرفت ہے؛ لیکن ضرورت سے زیادہ انگریزی الفاظ کے استعمال سے افسانے کے زبان و بیان کی حلاوت کہیں کہیں بدمزگی کا احساس دلاتی ہے۔ ''مائی گڈنیس''، ''رٹیارڈڈ''، ''ایب نارمل''، ''سکنڈ بھر''، ''ایڈریس''، ''ارجنٹ''، ''شاپنگ''، ''مین ٹے لیٹی''، ''سچویشن''، ''وری سیڈ''، ''سوری''، ''ڈیسنٹ''، ''شوروم''، ''دماغی ٹینشن''، ''رِنگ''، ''اکسائٹیڈ''، ''ٹوٹل امپریشن''، ''میچنگ''، ''کارنر''، ''فل کورس کھانا''، ''فِٹ''، ''میجر آپریشن''، ''انڈر آبزرویشن''، ''ٹاٹا''، ''ڈیو''، ''اسٹڈی''، ''کامن لان''، ''فنگر بلیئرڈ'' (''رِسک''، ''بور''، ''ٹو مچ''، ''پرابلمس''، ''فزیکلی فٹ''، ''نروس سسٹم''، ''منطل ویوز''، ''مائی گاڈ''، ''کام ڈاؤن''، ''کنول ژنس''، ''امی ٹیشن''، ''جویلری''، ''فیملی فرینڈ''، ''ڈریس'' وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کی جگہ اگر اردو متبادلات استعمال ہوئے ہوتے تو اسلوب میں مزید دلکشی پیدا ہو جاتی۔

تخلیقی ادب میں زبان کے استعمال کی سطح پر تخلیق کار کو ایک طرح کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ یعنی اپنے اسلوب کو منفرد اور اُسے ایک الگ پہچان دینے کی غرض سے وہ زبان کے طے شدہ اصولوں سے انحراف بھی کر سکتا ہے۔ جسے لسانیاتی انحراف کہا جاتا ہے۔ اگر چہ فکشن کے مقابلے میں شاعری میں لسانیاتی انحراف سے زیادہ کام لیا جاتا ہے؛ لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ فکشن میں لسانیاتی انحراف کو ایک ادبی پیرائے کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایک بات تو طے ہے کہ غیر ادبی تحریروں میں گرامر کی سطح پر جملے کی صحیح ساخت الفاظ کی ترتیب و تنظیم پر منحصر ہے؛ لیکن ادبی تحریروں میں بعض دفعہ الفاظ کی ترتیب و تنظیم میں تقدم و تاخر سے کام بھی کم لیا جاتا ہے۔ اگر چہ پہلی نظر میں جملے کی ساخت گرامر یا قواعد کی رُو سے درست معلوم نہیں ہوتی ہے؛ لیکن شعری زبان کی سطح پر زبان کا یہ طریق استعمال بھی درست ہوتا ہے۔ اس تناظر سے مذکورہ افسانے کے مکالمے دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ حالاں کہ کامیاب مکالمہ نگاری کے لیے افسانہ نگار کو کردار خود جینے پڑتے ہیں تا کہ مکالمہ اور کردار میں لاتعلقی پیدا نہ ہو۔ لاتعلقی اس اعتبار سے کہ مکالمہ کردار کی مناسبت سے نہ ہو یا پھر اُس کی کیفیت، طبیعت اور اُس کے ہاؤ بھاؤ سے میل نہ کھاتا ہو۔ مثال کے طور پر جس طرح حقیقی زندگی میں کئی لوگوں کے بات کرنے کا ڈھنگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، ٹھیک اُسی طرح افسانے میں بھی کرداروں کی مکالماتی زبان میں فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ مذکورہ افسانے میں تین کرداروں یعنی ذکی، بوا اور زیبا کے مکالمے ہیں۔ چند مکالمے ملاحظہ کریں۔:

بوا: ''تب سے زرین کے لیے وقف ہو کر رہ گئی ہے زیبا۔'' /زیبا: ''آپ نے ذکی صاحب کو یہاں آنے کی ناحق اجازت دے دی آنٹی۔'' /ذکی: ''اس واقعے کا صرف یہی ایک پہلو عمدہ رہا کہ ایک ڈیسنٹ انسان سے ملاقات ہوگئی ہے تمھاری۔'' /بوا: ''بے حد اکسائٹیڈ تھی وہ۔'' /ذکی: ''تب تو بشوق جائیں آپ۔'' /بوا: یہ چھوٹی بٹیا کے موڈ پر منحصر ہے بیٹے۔'' /ذکی: گویا سب چیزوں کو الگ الگ پہچان لیتی ہیں زرین۔'' /ذکی: یہ تو بڑی امید افزا صورت حال ہے بوا۔'' /بوا: بڑی بٹیا ہی سمجھا سکیں گی آپ کو۔'' /بوا: ''کبھی چند منٹ سے زیادہ دلچسپی نہیں لی چھوٹی بٹیا نے ان میں۔'' /ذکی: ''اہو! تب تو ان سے ملاقات ڈیو رہی میری۔'' /زیبا: ''نہیں بوا۔ ایسا کوئی رسک نہیں لے سکتی میں۔'' /زیبا: ''اگر شادی کے بعد ذکی نے بھی زرین اور پاپا کو بوجھ سمجھنا شروع کر دیا تو برداشت نہیں کر سکوں گی میں۔''

مذکورہ بالا مکالموں میں عمومی قواعدی اصلوں سے انحراف کیا گیا ہے، جو کہ ادبی زبان میں جائز ہے؛ لیکن اکثر مکالمے اسم، اسم فاعل اور ضمیر واحد متکلم کو جملے کے آخر میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تینوں کرداروں کے بات کرنے کا ڈھنگ ایک جیسا ہے، جو کہ ممکن نہیں ہے اور نہ ہی افسانے کی شعریات کے تناظر سے درست ہے۔ اب اس سے دوسرا پہلو یہ نکالا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار نے محض اپنے اسلوب کو ایک منفرد شناخت دینے کے لیے مکالموں کو عامیانہ انداز میں پیش کیا ہے؛ لیکن تینوں کردار کے یہاں مکالماتی زبان کی یکسانیت نے مکالمہ نگاری میں گویا رخنہ ڈال دیا ہے۔

❑❑❑

Dr. Owais Ahmad Bhat
Deptt. of Urdu
University of Kashmir
Hazratbal-190006 (Jammu & Kashmir)
Phone: 9149958892

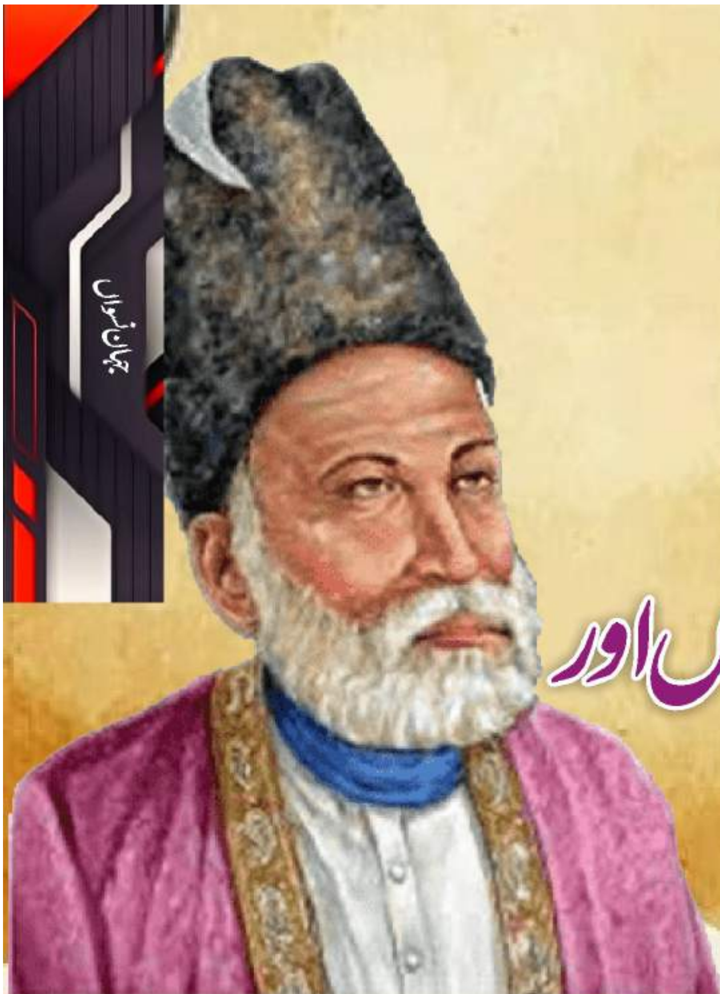

فرزانہ پروین

غالب کا ہے انداز بیاں اور

اردو ادب میں اب تک ہزاروں شعراء آئے اور سینکڑوں شعراء نے اپنی شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر اردو شاعری میں اپنی انفرادی شناخت بھی بنائی۔ ہم ان شعراء کو بڑا شاعر، معتبر شاعر، مقبول شاعر تو کہتے ہیں لیکن لفظ ''عظیم'' کا استعمال فقط تین شعرا کے لیے کیا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں میر تقی میر، انیسویں صدی عیسوی میں مرزا غالب اور بیسویں صدی عیسوی میں علامہ اقبال عظیم شاعر قرار دیے گئے۔ تینوں کی حیثیت اپنی اپنی جگہ مسلم ہے لیکن آج بھی جب اردو کے سب سے بڑے شاعر کی بات آتی ہے تو ادب کا ایک بڑا طبقہ اس کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ہم میر اور غالب میں کسے برتر کہیں؟ میرا مقصد یہاں میر و غالب کا موازنہ کرنا نہیں ہے بلکہ یہ کہنا مقصود ہے کہ میر تقی میر بھلے ہی ناقدین ادب کی نگاہ میں خدائے سخن ہوں مگر جو عوامی شہرت اور مقبولیت غالب کے حصے میں آئی وہ اردو کے کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔

غالب کی شاعرانہ عظمت کو آج پوری دنیا تسلیم کرتی ہے۔ ہندوستان کا غیر اردو داں طبقہ بھی غالب کے نام اور اشعار سے واقف ہے۔ غالب کو جو شہرت دوام حاصل ہے اس کی وجہ ان کے فکری محاسن سے زیادہ ان کا وہ منفرد شعری اسلوب ہے جس نے نہ صرف اردو تنقید کو متاثر کیا بلکہ ہر خاص و عام کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ان کی زندگی میں بھلے ہی ان کی پزیرائی نہ ہوئی ہو لیکن انھیں اپنی شاعرانہ عظمت کا احساس تھا تبھی وہ پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اس شعر کا سارا حسن لفظ ''اور'' میں مضمر ہے کیونکہ غالب کے یہاں جو منفرد انداز اور لب و لہجہ ملتا ہے وہ انھیں دوسرے شعرا سے ممتاز بناتا ہے۔

غالب ہر خاص و عام میں مقبول شاعر ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ غالب کی شاعری میں فکری، فنی، اسلوبیاتی، نظریاتی خوبیوں کے ساتھ گہرائی و گیرائی کا جہان معنی پوشیدہ ہے جس میں ہمہ گیری بھی ہے اور بلند آہنگی بھی، فکر انگیزی بھی ہے اور جمالیاتی پہلو بھی۔ ان کی شاعری میں جو دل آویزی، لطافت، مستی، سرشاری، ندرت، جدت، تازہ خیالی، سادگی میں پرکاری ہے وہی غالب کو سب سے اہم شاعر بناتی ہے۔

ان کی مقبولیت کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے جتنے اشعار اور مصرعے ضرب المثل کے طور پر زبان زد ہو چکے ہیں شاید ہی کسی اور شاعر کے حصے میں یہ اعزاز آیا ہو مثال کے طور پر چند مصرعے اور اشعار دیکھیں:

''بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے''
''نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟''

''دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے''
''مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں''

''شرم تم کو مگر نہیں آتی''
''درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا''
''ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا''

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

شعر چاہے مشکل پسندی کی اعلیٰ مثال ہو یا سہل ممتنع کی، اگر اس میں کچھ نیا نہ کہا جائے یا نئے ڈھنگ سے نہ کہا جائے تو بہر حال شاعری تو ہو جاتی ہے لیکن اعلیٰ درجے کی شاعری نہیں ہو پاتی، اور وہ دیرپا تاثر بھی قائم نہیں کر پاتی۔ کسی بھی مفہوم کو بیان کرنے کے لیے جدت طرازی بہت ضروری ہے اور غالب تو اپنی جدت طرازی کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے وہ روایت سے بغاوت کرنے والے شاعر تھے انھوں نے کسی کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے اپنی راہ خود نکالی۔ وہ کسی بھی نکتے اور نظریے کو اپنے منفرد انداز اور مخصوص لب و لہجے میں ادا کرتے تھے۔ دیوان غالب کے مطالعہ سے یہ آشکارا ہوتا ہے کہ انھوں نے کئی اشعار میں قافیہ اور ردیف کا خوبصورت امتزاج پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر اشعار دیکھیں:

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

مذکورہ شعر جس غزل کا ہے اس میں آنے، جانے، اٹھانے، بہانے وغیرہ قوافی ہیں جب کہ ردیف ہے ''کی'' قوافی میں حرف روی الف ہے۔ غالب نے شعر کے مصرع ثانی میں بارہا کہہ کر حرف روی کو نبھایا اور قافیہ کا بقیہ حصہ ''نے'' اور ردیف ''کی'' کو ملا کر ''نیکی'' لفظ کا استعمال کس فنی مہارت سے کیا ہے اس کی مثالیں بہت کم شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد ، آیا

یہ شعر جس غزل سے ماخوذ ہے اس میں قوافی سفر، نظر، مگر، سر، گھر وغیرہ ہیں اور ردیف ہے ''یاد آیا''۔ غالب نے اپنی ہنرمندی دکھاتے ہوئے قافیہ 'فر' اور ردیف 'یاد آیا' کو اس طرح ملایا کہ فریاد آیا بن گیا۔

رہزنی ہے کہ دلِستانی ہے؟
لے کے دل، دلِستاں روانہ ہوا

مذکورہ بالا شعر میں لفظ ''روا'' قافیہ اور ''نہ ہوا'' ردیف ہے جسے شاعر نے بڑی خوبصورتی سے ''روانہ ہوا'' ادا کیا ہے جبکہ غزل کے قوافی برا، مزا، ادا، گلا وغیرہ ہیں اور ردیف ''نہ ہوا''۔ یہ اشعار اس بات پر دال ہیں کہ غالب میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو کسی شاعر کو آفاقی بناتی ہیں۔

انسان کی زندگی عروج و زوال، خوشی، غم، اذیت، اداسی، بے بسی، مجبوری، قہقہہ، خاموشی غرض کہ ان جیسی کتنی ہی کیفیات کی آماجگاہ ہے۔ ہر شخص کبھی بے حد خوش ہوتا ہے تو کبھی غمگین، کبھی خلوت پسند کرتا ہے تو کبھی جلوت، کبھی بلا سبب ہی اداس ہو جاتا ہے تو کبھی اس کے لبوں پہ مسکان ہوتی ہے۔ شاعری انہی کیفیات و جذبات کو لفظوں میں اس طرح پرونے کا نام ہے جو سیدھے دل میں اتر جائے۔ غالب کے یہاں جذبات و احساسات کا ایسا برملا اظہار ملتا ہے کہ اس کے حسن کو لفظوں میں پرونا مشکل ہے۔ چند اشعار دیکھیں

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

میری قسمت میں غم اگر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

عشق میں ملنے والے درد و اذیت، سوز و گداز، محبت کی شدت کو ان اشعار میں صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ عشق تو ایک آفاقی جذبہ ہے اور اردو

شاعری کی یہ روح ہے اسے زمانہ قدیم سے اب تک تقریباً تمام شعرا نے اپنے اپنے انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے لیکن غالب نے اس کے ان گنت پہلوؤں کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے اور اس کے معاملات، واردات اور کیفیات کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔

تکرار لفظی کا شمار شاعری کے عیوب میں ہوتا ہے لیکن شاعر اگر اسے برتنے کے ہنر سے آشنا ہے اور استادانہ کمال رکھتا ہے تو یہی عیب شعر کا حسن بن جاتا ہے اور شعر کو شاعری کی معراج عطا کرتا ہے اور اگر اسے برتنے میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو شعر بوجھل بن کر رہ جاتا ہے۔ غالب نے اپنے اشعار میں لفظوں کی تکرار سے الگ ہی حسن پیدا کیا ہے اور کہیں وہ زور بیان کے لیے بھی ایک ہی لفظ کو بار بار لاتے ہیں۔ تکرار لفظی کی مثال میں غالب کے چند اشعار دیکھیں اور اس کی غنائیت پر سر دھنیں:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اس شعر میں غالب کا منفرد انداز دیکھیں:

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

مذکورہ بالا شعر میں استعارے و کنایے اور لفظی تکرار نے ان کے حسن میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ شاعر نے ہجر کی اذیت اور تنہائی کی اداسی کا اظہار بڑے کرب کے ساتھ کیا ہے کہ ہجر کی رات کاٹے نہیں کٹتی، شام سے صبح کرنا کتنا کٹھن امر ہے شاعر ہر سانس ایک نئی موت مرتا ہے اور اس کا دل زخم زخم ہے لہذا وہ کہتا ہے کہ میرے زخموں کا حال مت پوچھ، اسے کرید کرید کر ہرا نہ کر، تنہائی نے میری حالت غیر کر دی ہے اور اس رات کا گزرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا فرہاد کے لیے جوئے شیر کا لانا۔ شاعر نے یہاں غضب کی مثال دے کر شعر کو جو معنویت عطا کی ہے یہی انھیں دیگر شعراء سے منفرد بناتی ہے۔

غالب کے اشعار میں شعری بول چال اور استفہامیہ انداز جا بجا ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوط میں تکلم کا سماں تو پیدا کیا ہی ہے لیکن ان کے اشعار بھی اس ہنر سے خالی نہیں ان کا استفہامیہ اور تکلم بھرا لہجہ شعر میں جو جاذبیت پیدا کرتا ہے اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار دیکھیں۔

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا؟
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور؟

مجھ سے مت کہہ: ''تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی''
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے، قیامت ہے!
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی؟

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

غالب کے کلام کی ایک اور خصوصیت تہہ داری ہے جو انھیں دیگر شعرا سے ممتاز کرتی ہے بظاہر بہت آسان اور سادہ نظر آنے والا شعر بھی سیدھا سادا اور سپاٹ نہیں ہوتا ہے بلکہ اس میں کتنے ہی پیچ و خم، نشیب و فراز، رمز و ایما اور اشارے کنائے ہوتے ہیں شعر پرت در پرت جب کھلتا ہے تو اس کے الگ الگ معانی سامنے آنے لگتے ہیں ایک شعر دیکھیں:

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

بظاہر شعر سادہ ہے۔ سہل ممتنع ہے اور سہل ممتنع میں ایک جہاں آباد ہوا کرتا ہے۔ شاعر نے نہایت سادگی سے اپنی بات مکمل کی ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے لیکن نیند کے لیے تو کوئی وقت مقرر نہیں۔ جو معنی پوشیدہ ہے وہ یہ کہ شاعر کہہ رہا ہے کہ ایسا تو نہیں کہ میری نیند موت بن گئی ہے جو وقت پر ہی آئے گی۔

ایک اور شعر میں غالب کہتے ہیں

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اس شعر کا کلیدی لفظ 'لڑکپن' ہے اور لڑکپن بچپن اور جوانی کے درمیان کا مرحلہ ہے یعنی بچپن میں کوئی شعور نہیں ہوتا جبکہ لڑکپن میں شعور

شروع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے شاعر نے لفظ لڑکپن کا استعمال کر کے شعر کے حسن و معنی کو دوبالا کر دیا ہے کہ میں نے لڑکپن میں جب مجنوں پر پتھر اٹھایا تو اپنا ہی سر یاد آیا۔

اسی غزل کا ایک اور شعر دیکھیں

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ شاعر دشت کی جانب جاتا ہے اور وہاں کی ویرانی اسے اپنے گھر کی یاد دلاتی ہے کہ اسی دشت کی طرح میرا گھر بھی ویران ہے جبکہ اس شعر کے مصرع اولیٰ کو اگر حقارت سے ادا کیا جائے تو یہ معنی نکلتا ہے کہ بھلا دشت کی ویرانی بھی کوئی ویرانی ہے اس سے زیادہ تو میرا گھر ویران پڑا ہے اصل ویرانی دیکھنی ہو تو میرا گھر دیکھو۔

ایک اور شعر میں غالب بظاہر بڑی سادگی سے کہتے ہیں

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اس کا آسان سا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ میں دنیا کے دکھ، درد و غم سے اکتا گیا ہوں کوئی تو میرے دکھ کی دوا کرے اور حضرت عیسیٰ میرے مسیحا بن کر آئیں، مگر ہم ذرا سا غور کریں تو دیکھیں گے کہ اس شعر کا اصل حسن لفظ ''کوئی'' میں پوشیدہ ہے شاعر کہتا ہے کہ ابن مریم کوئی ہوتا ہے تو ہوا کرے لیکن میرے دکھ کی دوا جو کر رہا ہے وہی میرے لیے ابن مریم ہے۔ کیونکہ اب اس زمانے میں کوئی عیسیٰ تو پیدا نہیں ہوں گے۔

چھوٹی بحر میں بڑی بات کہہ جانا، وہ بھی تہہ داری ایسی کہ شعر جتنی بار پڑھا جائے غور کیا جائے وہ پرت در پرت نئے مفہوم کے ساتھ سامنے آتا ہے سہل ممتنع کے شعر کی خوبی بھی یہی ہوتی ہے کہ اس میں معنی کی کئی جہتیں ہوتی ہیں۔

شاعری میں تلمیحات، رمز، اشارہ کنایہ، استعارہ کا ہونا اشد ضروری ہے کیونکہ اس سے معنی میں وسعت اور شعر میں حسن پیدا ہوتا ہے تلمیح شعر کو اس قدر بلیغ کر دیتا ہے کہ ہمارا ذہن ان تاریخی واقعات کی جانب گردش کرنے لگتا ہے اور ہم اس کے سحر میں کھو جاتے ہیں دیوان غالب میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں تلمیح کو اس طرح برتا گیا ہے کہ اس کا حسن دوچند ہو گیا ہے نمونہ اشعار دیکھیں:

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

غالب کی شخصیت پر بہار تھی ان کی طبیعت میں شوخی و ظرافت کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ انہوں نے اپنی شوخی سے کسی کی دل آزاری کرنے یا کسی کو نیچا دکھانے کا کام نہیں کیا بلکہ اس میں زندگی اور جولانی پیدا کی ہے، جدت اور ندرت پیدا کی ہے، ان کی شوخی کے کئی واقعات مشہور ہیں اپنے اسی ظریفانہ انداز کو انھوں شعری پیکر میں بھی ڈھالا ہے۔

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں، صرف درباں ہو گئیں

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی جگہ اور سہی

دیوان غالب دراصل ایک ایسا گلدستہ ہے جو مختلف و منفرد رنگ و بو کے پھولوں سے آراستہ ہے۔ ان کے قبل اور بعد کے کسی شاعر کے یہاں وہ انداز، وہ اسلوب، وہ لہجہ نہیں ملتا جس کے سبب کوئی شاعر اپنا ''انداز بیاں اور'' ہونے کا دعوی کر سکے۔ یہ دعویٰ صرف اور صرف غالب نے کیا اور وہ اس میں حق بجانب بھی ہیں۔ اسی دعوے کی صداقت کی بنیاد پر غالب اپنی شہرت، مقبولیت اور عظمت کی وجہ سے آج تک تمام شعراء پر غالب ہیں۔

□□□

Farzana Parvee n
Assistant Teacher
The Quraish Institute
5/1, Kimber Street
Kolkata - 700017 (W.B)

سیدہ مریم الٰہی

اردو اخبارات میں خواتین کا حصہ

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

کتنی صداقت ہے اکبر الہ آبادی کے اس شعر میں کہ آج سے برسوں قبل صحافت کی اہمیت اور اخبار کی معنویت کو محسوس کر لیا تھا، انھوں نے کہا کہ جنگ جیتنے کے لیے کمان کی نہیں اخبار کی ضرورت ہے کیونکہ اردو اخبارات نے سیاسی اور سماجی ہر طرح سے کردار ادا کیا ہے۔ کیونکہ صحافت ایک جرائت مندانہ پیشہ ہے، اس کی اہمیت اور افادیت ہر زمانے میں محسوس کی گئی ہے اور صحافت کے دو سو سالہ سفر میں خواتین صحافی کی شمولیت تقریباً ایک صدی بعد ہوئی۔ اس کے متعدد اسباب تھے۔ کیونکہ ہندوستانی معاشرے میں خواتین کی تعلیم کا فقدان تھا۔ بہت کم گھرانے ایسے تھے جو خواتین کی تعلیم مکمل کراتے تھے اور صحافت وغیرہ کا پیشہ اختیار کرنا دور دور تک تصور نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ اُس دور میں کچھ ہی خواتین ایسی تھیں جو لکھنے کا کام کر رہی تھیں وہ بھی اپنا نام پوشیدہ رکھ کر۔ لیکن جیسے جیسے وقت بدلا اور تحریک آزادی کے بعد سر سید احمد خاں کو اینگلو محمڈن اسکول قائم کرنے کا خیال آیا اور علما اور مشائخ کی جانب سے شدید مخالفت کے باوجود آزاد خیال والدین نے لڑکیوں کو اسکول جانے کی اجازت دی اور کچھ ہی عرصے میں عام گھرانے کی خواتین کے لیے بھی اعلیٰ تعلیم کی راہ ہموار ہوئی۔ یہی وہ دور تھا جب تعلیم یافتہ خاندانوں کے علاوہ متوسط طبقے کی خواتین بھی گھر کی چہار دیواری سے باہر نکلیں اور اردو صحافت میں بھی قدم رکھا۔

جہاں تک اردو میڈیا میں خواتین کے حصہ کا تعلق ہے تو اس شعبے میں خواہ وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک یا ویب میڈیا ہو یا موجودہ دور میں سوشل میڈیا ہر شعبے میں خواتین نے اپنی موجودگی درج کرائی اور ملک و قوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ اردو کی آبیاری کی۔ اگر ہم تاریخ کے اوراق کو پلٹ کر ایمانداری سے محاسبہ کریں تو ہر دور میں ہر شعبے میں خواتین نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ شروعاتی دور میں خواتین کی صلاحیتوں سے بے اعتنائی برتی گئی اور ان کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا لیکن ایک وقت بعد ان کی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کیا گیا۔

اردو صحافت میں خواتین کا داخلہ 80 کی دہائی میں نظر آیا جب وہ روزناموں میں بھی کام کرتی نظر آئیں۔ جہاں تک خواتین کے اخبار و رسائل کی اشاعت کا سوال ہے تو سب سے پہلے مولوی سید احمد علوی (مؤلف فرہنگ آصفیہ) نے 1884 میں ''اخبار النساء'' کے نام سے اردو میں خواتین کا پہلا اخبار دہلی سے جاری کیا۔ یہ اردو میں خواتین کا پہلا اخبار مانا جاتا ہے۔ مولوی سید محمد علوی کا شمار اولین مصلحین میں ہوتا ہے جنھوں نے عورتوں کی تعلیمی اور سماجی ترقی میں گہری دلچسپی لی اور اس مقصد کے حصول کے لیے باقاعدہ عورتوں کا اخبار جاری کیا تھا اور یہ اخبار 350 کی تعداد میں شائع ہوتا تھا۔ جب سید محمد علوی کا تبادلہ شملہ ہو گیا تھا تو وہی سے اس اخبار کی ادارت کرتے تھے اور یہ برصغیر کا صحافت نسواں کا اولین علمبردار اخبار بن گیا تھا کیونکہ اس کو خواتین کی اصلاح اور تربیت کے لیے نکالا گیا تھا۔

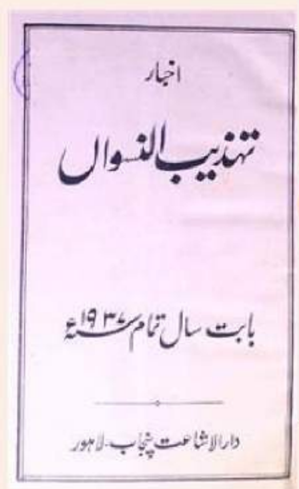

اس وقت کیونکہ اخبار و رسائل خواتین میں بیداری لانے، تعلیم نسواں کو اجاگر کرنے اور تشہیر و اشاعت کے لیے نکالا جاتا تھا۔ جیسے ''شریف بیویاں'' لاہور سے 1893 میں منظر عام پر آیا اس کے بعد ''معلم نسواں'' جو حیدر آباد سے 1894ء میں شائع کیا گیا۔

اس کے بعد دوسرا اخبار ''تہذیب نسواں'' 1898 میں خواتین کا پہلا ہفتہ واری اخبار تھا، جس کی مدیرہ محمدی بیگم تھیں۔ محمدی بیگم شمس العلماء مولوی ممتاز علی کی بیگم اور مشہور ڈراما نویس امتیاز علی تاج کی والدہ تھیں جو عمدہ انشا پرداز بھی تھیں۔ ''تہذیب نسواں'' کے کم و بیش ایک ہزار ایڈیشن نکلے۔ اس اخبار کا نام ''تہذیب الاخلاق'' سے مشابہ سر سید احمد خاں نے تجویز کیا تھا۔ محمدی بیگم کے انتقال کے بعد مولوی ممتاز کی صاحب زادی وحیدہ بیگم نے اس اخبار کی ادارت سنبھالی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی بڑی بہو آصف جہاں اس کی مدیرہ رہیں۔ اس کے بعد مولوی ممتاز کے بیٹے امتیاز علی تاج نے اپنی اہلیہ مشہور مصنفہ حجاب امتیاز کے ساتھ اس کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔

تہذیب نسواں دو کالمی اخبار تھا جس میں مضامین مختصر ہوتے تھے اور وہ متوسط طبقے کے اردو داں گھرانوں میں پہنچتا تھا جس کے باعث خواتین میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا اور ساتھ ہی ان کا سماجی اور سیاسی شعور بھی بیدار ہوا۔

اس کے بعد اخبار ''خاتون'' 1904 میں علی گڑھ سے نکلا اور خواتین کے اخبار و رسائل نکلنے کا سلسلہ چل پڑا جیسے ''پردہ نشیں'' 1906 میں آگرہ سے نکلتا تھا، ماہنامہ عصمت دہلی سے 1908 میں نکلتا تھا۔

اس کے بعد 1919 میں حیدر آباد سے صغریٰ بیگم نے ''النساء'' کے نام سے ماہنامہ نکالا، 1929 میں عصمت آرا حجاب نے ماہنامہ ''خاتون مشرق'' کی ادارت کی۔ ''امہات'' قمر النساء بیگم نے 1939 میں نکالا، ''آفتاب نسواں'' کی سرور جہاں، انور جہاں مدیرہ تھیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ایسے صحافی خواتین تھیں جو آزادی سے قبل ہی گمنامی کا شکار ہو کر اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

آزادی سے پہلے کی طرح آزادی کے بعد کے دور کا جائزہ لیا جائے تو تقسیم ہند کے بعد سیاسی اور سماجی منظر نامہ بدل گیا اور پورے ملک کو پر آشوب دور کا سامنا کرنا پڑا اور ظاہر ہے اس کا اثر اخبارات اور رسائل پر بھی پڑا، اور رسائل اور اخبارات بھی ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم ہو گئے مگر ترقی کرتے رہے۔ آزادی کے بعد خواتین کے ہر میدان میں آگے بڑھنے کے امکانات مزید روشن ہوئے اور ترقی پسند رجحان کی مسلم خواتین پہلے سے ہی موجود تھیں اس لیے نئے حالات اور تقاضوں کے تحت مزید اخبارات اور رسائل منظر عام پر آنے لگے لیکن خواتین کا ہر رسالہ اور اخبار ادبی مزاج کے ساتھ مذہبی و سماجی فکر کا بھی حامل ہوا کرتا تھا۔ خواتین میں قلم کے استعمال کا شوق و جذبہ ضرور پروان چڑھا، لیکن آج کے معنوں میں جن کو صحافی کہا جاتا ہے، اُن کی تعداد بہت کم تھی بلکہ یوں کہیں کہ انگلیوں پر گنے جانے کے قابل تھی۔ کیونکہ رسائل اور جرائد تو خواتین خوب نکال رہی تھیں لیکن اردو اخبارات میں خواتین کا کردار کم و بیش ہی نظر آتا تھا۔

اردو میں پہلی صحافی کا اعزاز بھوپال کی خالدہ بلگرامی کو حاصل ہوا، جو روزنامہ ''آفتاب جدید'' سے باضابطہ 22 سال تک جڑی رہیں۔ خالدہ بلگرامی کے بعد نور جہاں ثروت کو پہلی صحافیہ کا اعزاز اس لیے دیا گیا کیونکہ وہ ہندوستان کی وہ بے باک صحافیہ ہیں جنھوں نے روزنامہ اخبارات کی صحافت میں قدم رکھا اور ان کو کسی روزنامہ کے ادارتی بورڈ کا صدر بنایا گیا تھا یہ عہدہ ان کے خوابوں کی تعبیر تھا۔ 1980 میں عشرت علی صدیقی کے ماتحت روزنامہ ''قومی آواز'' میں بطور نمائندہ کام کا آغاز کیا اور اپنے کام کا لوہا منوایا۔ اس کے بعد روزنامہ ''انقلاب'' کے دہلی ایڈیشن کی ریذیڈنٹ مدیرہ کے طور پر کام کرتی رہیں۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہیں اور سیاست داں، مشاہیر ادب وغیرہ کے انٹرویو لیا کرتی تھیں۔

نور جہاں ثروت کے علاوہ اردو اخبارات کی ادارت 'وسیم راشد' ہفتہ وار اخبار ''چوتھی دنیا'' سے منسلک رہیں۔ اُن دنوں روزناموں میں ہفتے میں ایک دن خواتین ایڈیشن ہوا کرتا تھا، جسے اکثر خواتین ہی ترتیب دیا کرتی تھیں۔

ان کے علاوہ پاکستان میں فاطمہ بیگم نے لاہور سے 1948 میں اردو اخبار ''خاتون'' کے نام سے نکالا تھا۔ اسی طرح محترمہ فوزیہ شاہین

اخبار ''جنگ'' سے وابستہ ہیں ۔ایسے ہی زاہدہ حنااور مشہور شاعرہ پروین شاکر بھی 'جنگ' میں کالم نویس کی حیثیت سے مشہور رہی ہیں ۔عاصمہ چودھری اخبار ''ڈان'' سے وابستہ ہیں ۔ ایسے ہی زبیدہ مصطفیٰ،زیب النساء،فرحت صدیقی وغیرہ ایسے نام ہیں جو اخبارات اردو میں خواتین صحافی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

پندرہ روزہ اخبار ''مگدھ پنچ'' پٹنہ سے 1978 میں معصوم اشرفی کے ساتھ محترمہ شمشاد جہاں کو دیکھا جاسکتا ہے۔1990-91 میں پٹنہ سے ہی نکلنے والا روزنامہ ''ان دنوں'' کی مدیرہ نکہت سلطانہ ہیں، یہ روزنامہ صرف ایک روپے کی قیمت میں اپنے قارئین کے ذوق کی تسکین کرتا تھا۔ ان کے علاوہ اردو صحافت میں اپنی پہچان بنانے والی ممبئ کی ''شیرین دلوی'' جو جناب عبدالستار دلوی کی صاحب زادی تھیں، جو''اودھ نامہ'' کی ایڈیٹر بھی تھیں اردو صحافت میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب رہیں۔

بھوپال کی ''سلطانہ حجاب'' نے برسوں روزنامہ ''ندیم'' میں کام کیا اور اس کے لیے خواتین کا صفحہ بھی ترتیب دیا۔ایک اور صحافی کشمیر سے 'عالیہ ناز'' جو جے این یو سے تعلیم یافتہ ہیں۔

خواتین میں بیشتر نام عہد حاضر میں بھی ابھر رہے ہیں۔اخبارات سے وابسطہ خواتین صحافی تو ہیں لیکن مردوں کے مقابلے ان کی تعداد بہت کم ہے۔ جیسے 'وسیم راشد' نے روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' سے اردو صحافت میں قدم رکھا۔ 'نازیہ نوشاد' راشٹریہ سہارا پٹنہ کی او'رزرین فاطمہ' انقلاب پٹنہ میں نائب مدیرہ کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

اخبار ''نوائے وقت'' کی مدیرہ عارفہ صبیحہ بھی ایک اچھی صحافی ہیں۔ان کے علاوہ 'نوید وقت'' کی ایمان محمد جو پہلی خاتون صحافی ہیں جنھوں نے غزہ اور اسرائیل جنگ کی تصویر کشی کر کے اپنا نام فوٹو جرنلسٹ میں درج کرایا ہے۔

'ثمیرہ عزیز' پہلی سعودی خاتون ہیں جو میڈیا میں کام کر رہی ہیں، 'آواز' میں مینجنگ ایڈیٹر اور گوشہ خواتین کی انچارج ہیں۔اسی طرح پرنٹ میڈیا میں ڈاکٹر شمع افروز زیدی ،سعدیہ دہلوی ،طلعت سلیم ،غزالہ صدیقی ،زرینہ صدیقی اور شہلا نواب وغیرہ بھی اردو میں مخصوص شناخت رکھتی ہیں۔

اردو اخبارات میں خواتین کی حصہ داری کی تفصیلات کے بعد اردو روزناموں میں خواتین کے لیے جو مخصوص کالم بنائے گئے ہیں ان کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ہندوستان میں سبھی اردو روزناموں میں خواتین کے لیے کالم بنائے گئے ہیں جن میں خواتین کی کہانی، غزل، نظم، مضامین یا خواتین کے مسائل کو پیش کیا جاتا ہے۔

بمبئ کے روزنامہ انقلاب (آٹھوں ایڈیشن)، اردو ٹائمز، کلکتہ کا اخبار مشرق (سات ایڈیشن)، آبشار، آزاد ہند، اور پٹنہ کا قومی تنظیم، دہلی اور حیدر آباد کے ملاپ، صحافت، ہمارا سماج، اور لکھنؤ کا 'آگ'، بنگلور کے سالار، پاسبان، بھوپال کے ندیم وغیرہ میں ہفتہ کے کسی ایک دن خواتین کے لیے مخصوص مواد کی اشاعت عرصے سے ہو رہی ہے۔روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کے بھی تمام ایڈیشن میں اتوار کے دن شائع ہونے والے ''امنگ'' میں بھی نصف صفحہ خواتین کے لیے ہے۔

ان تمام تفصیلات سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک کی میڈیا میں اردو خواتین میڈیا کو اخبارات اور رسائل کی تعداد، تنوع اور کردار کے لحاظ سے سب سے زیادہ سبقت حاصل ہے۔ بدنصیبی ہے کہ اردو خواتین میڈیا کا یہ کردار سامنے نہیں لایا گیا جس کے سبب یہ پہلو دب کر رہ گیا۔ جبکہ خواتین نے اخبارات میں بھلے ہی کم کارنامے انجام دیے ہوں لیکن معیاری اور زبردست ہیں جس کے باعث آج معاشرے میں بیداری دیکھنے کو ملتی ہے، تعلیم کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے، اب تو باضابطہ صحافت کی تعلیم مختلف یونیورسٹی میں ہو رہی ہے اور مردوں کے ساتھ خواتین بھی صحافت میں سند حاصل کر رہی ہیں۔لیکن اس کورس میں جن سہولیات کی ضرورت ہے خاص کر اردو میں فی الحال ہر یونیورسٹی میں دستیاب نہیں ہیں، اس لیے اردو مضامین میں بڑی تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور اردو زبان سے دوری اردو صحافت کے عمومی معیار کو مجروح کر رہی ہے۔

اتنے کارناموں کے بعد بھی خواتین صحافی کی خدمات کا عکس نمایاں نہیں ہو سکا ہے البتہ اردو صحافت کا معیار ابھی بھی تسلی بخش نہیں کیونکہ اردو صحافت کو ابھی بھی کارآمد اور نئی تحقیقات سے رنگین بنانے کی ضرورت ہے اور اس طرف خواتین صحافی آسانی سے متوجہ ہو سکتی ہیں اور مستقبل میں اردو کی نمائندگی کرتے ہوئے صحافت کے وسائل میں اضافے کا باعث بن سکتی ہیں۔ کیونکہ اخبارات سے وابستہ خواتین صحافی تو ہیں مگر مردوں کے مقابلے میں ان کی تعداد کم ہے، کیونکہ اس کے لیے آزاد ماحول اور کھلے دماغ کی ضرورت ہے اور اس کے لیے نئی نسل کی خواتین کو اردو اخبارات سے منسلک ہونے کی بھی سخت ضرورت ہے۔

Syeda Mariyam Elahi
Research Scholar
Dept. of Urdu
Chaudhary Charan Singh University
Meerut- 250001 (U.P)

ڈاکٹر مدثر احمد گنائی

مسز عبدالقادر کی افسانوی دنیا

بیسویں صدی میں افسانوی شعریات نے ایک نئی کروٹ بدلی جہاں ایک طرف روایتی طرز اظہار کے برخلاف حقیقت پسندی کی طرف توجہ دی گئی وہیں سماجی مسائل نے افسانے کی شعریات میں اپنی خاص پہچان بنائی۔ اگر ہم اس صدی کی ابتدا سے لے کر آخری دہائی میں افسانوی ادب پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ہر نئی تخلیق میں ایک نئی طرز فکر کے ساتھ ساتھ نیا طرز اظہار بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ گویا اس پوری صدی کے افسانوی ادب میں ہیئتی اور موضوعاتی اعتبار سے نت نئی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جن کو ادبی دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے اردو ادب میں ایسے قلم کار نمودار ہوئے جنھوں نے اپنی تخلیقات سے اردو ادب کو مغربی ادب کا ہم پلہ بنایا۔ یہ صدی اردو ادب کے حوالے سے بہت ہی زرخیز اور قابل فخر تھی۔ اس میں اردو شاعری کو عموماً اور فکشن کو خصوصاً ایسے تخلیق کار نصیب ہوئے جن کی تخلیقات سے اردو ادب کی عظمت کے قصیدے دنیائی ادب میں بھی پڑھے جانے لگے۔ اگر چہ اس صدی کے فکشن نگاروں نے اپنی الگ راہ اختیار کر کے حقیقت نگاری کو موضوع بنایا تاہم اس صدی میں کچھ ایسے بھی لکھنے والے نظر آتے ہیں جنھوں نے روایت کی پاس داری کر کے ادب کو تخلیق کیا اور جنھوں نے ڈرامائی حقیقت نگاری کے طرز اظہار کا سہارا لے کر اپنی ایک الگ رہ اختیار کی۔ ان میں ایک نام مسز عبدالقادر کا بھی ہے۔

مسز عبدالقادر اس دور میں پیدا ہوئیں جب ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ اس دور میں اردو فکشن داستانوی اسلوب سے نکل کر حقیقت نگاری کی طرف گامزن تھا لیکن اس دور کی ابتدائی چند دھائیوں کا فکشن بھی داستانوی اسلوب سے پورے طور پر مبرا نہیں تھا۔ اس دور کے تخلیق کار باوجود حقیقت پسندی کے داستانوی انداز بیان سے خود کو مکمل طور پر الگ نہیں رکھ سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس دور میں انگریزی کہانیاں پڑھنے کا عام رواج تھا جن کی بنیاد اکثر طلسماتی طرز اظہار پر تھی۔ ان کہانیوں میں H.Rider Haggard کا مشہور ناول ''She'' بے حد مقبول تھا۔ اس طرح کی کہانیوں کا اثر یہاں کے چند قلم کاروں پر بھی پڑا۔ اس اثر کو مسز عبدالقادر نے بھی قبول کیا۔ ان کی تمام تر تخلیقات کا وجود ہی طلسماتی طرز اظہار پر منحصر ہے۔ اگر چہ مسز عبدالقادر 1898 میں پیدا ہوئیں لیکن جس دور میں انھوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے وہ ترقی پسند تحریک کا ابتدائی دور تھا جس میں سماج کو موضوع بنایا گیا۔

مسز عبدالقادر کا اصل نام زینب خاتون تھا۔ ان کے شوہر کا نام

عبدالقادر تھا جو ریلوے انجینئر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ مسز عبدالقادر پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، والد مولوی فقیر محمد فاضلِ دیوبند تھے۔ اس وجہ سے ابتدا سے ہی ایک ادبی ماحول نصیب ہوا جس نے ان کے تخلیقی شعور کو فروغ عطا کیا۔ انہیں بچپن سے ہی سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا اس لیے اکثر سیر و تفریح میں مگن ہوتی تھیں، جس کی تصدیق ''صدائے جرس'' اور ''لاشوں کا شہر'' کے افسانوں سے ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1919-20 میں افسانہ ''لاشوں کا شہر'' لکھ کر کیا جو بعد میں ان کے افسانوی مجموعہ جو اسی نام سے اردو بک اسٹال سے 1936 میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں سات افسانے ہیں جن میں '' راکھشش، معلم کا راز، گلنار، زیتون، لاشوں کا شہر، آواگون، اور یوم محبت'' جیسے افسانے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مجموعہ کے آخر پر شوکت تھانوی کا لکھا ہوا ایک اختتامیہ بھی شامل ہے، جس کو کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں شامل کیا گیا ہے۔ اس اختتامیہ میں ان تمام افسانوں پر شوکت تھانوی نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''صدائے جرس'' 1939 میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ دو ناول راہبہ اور تخت باغ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ مرزا حامد بیگ نے ان کے اور چار نامکمل ناولوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن اس حوالے سے کوئی مکمل شہادت نہیں ملتی۔

مسز عبدالقادر پر ہونے والے تحقیقی کام کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو اس حوالے سے مایوسی ہی نظر آتی ہے کیوں کہ آج تک ہندوستان میں اس پر کوئی بھی تحقیقی مقالہ نہیں لکھا گیا۔ چند مضامین لکھ کر ان کی شخصیت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدا میں جہاں ایک طرف رومانیت اپنے شباب پر تھی وہیں دوسری طرف حقیقت نگاری بھی اپنی پہچان بنانے میں کمر بستہ تھی۔ نیز آگے چل کر ترقی پسندی نے ادب کے کینوس پر اپنی بھرپور چھاپ چھوڑ دی لیکن اس متصادم ماحول میں بھی مسز عبدالقادر نے روایت پسند افسانوی طرز اظہار کو برقرار رکھا۔ اگرچہ داستانوی طرز اظہار سے مصنفین نہ صرف کنارہ کش ہو رہے تھے بلکہ قاری کی مصروفیت کو دیکھ کر ناولوں کے بجائے افسانے کی طرف گامزن نظر آتے تھے، تاہم مسز عبدالقادر کے یہاں دونوں اصناف (ناول اور افسانہ) میں داستانوی طرز اسلوب دیکھنے کو ملتا ہے۔ نہ صرف طرز اسلوب بلکہ ان کے یہاں مافوق الفطری مخلوقات کی کثرت بھی پائی جاتی ہے اکثر کردار کسی طلسم میں گرفتار ہو کے کسی غیبی طاقت سے مدد لیتے ہیں۔ افسانے کی شروعات بھی داستانوی انداز میں ہی ہوتی ہے یعنی اس میں قصہ در قصہ کہانیاں چلتی ہیں۔ پہلے مرکزی کردار اپنی کہانی شروع کرتا ہے بعد میں کہانی کو ارتقا بخشنے کے لیے دوسرے کردار بھی اسی کہانی سے وابستہ ایک نئی کہانی شروع کرتے ہیں۔ گویا ان کے افسانوں میں بیانیہ طرز اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن مصنفہ کا کمال یہ ہے کہ قصہ در قصہ کہانی کہنے کے باوجود افسانے میں کہانی پن برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ افسانے میں جتنے بھی واقعات پیش کیے جاتے ہیں ان کا براہِ راست یا بالواسطہ مرکزی کردار سے رشتہ ہوتا ہے جو ان کی تحریر کو افسانہ کہنے پر قاری کو مجبور کرتا ہے۔

ان کے افسانوں میں جگہ جگہ راکھشس، بھوت اور ارواح نظر آتے ہیں اور اکثر افسانوں میں ایسے کردار شامل کیے گئے ہیں جن کا کوئی ہم شکل ہوتا ہے یا وہ دوسرا جنم لے کر پھر اسی شکل و صورت کے ساتھ افسانے کے کینوس پر رونما ہوتے ہیں جیسے افسانہ ''زیتون'' میں زیتون کی ہم شکل یاسمین، افسانہ ''لاشوں کا شہر'' میں ذکیہ اور شاد، ''آواگون'' میں ہر ایک کردار کا پُنر جنم ہوتا ہے، ''سمادھ کا بھوت'' میں بھی زلیخا تین جنم لیتی ہے۔ اسی طرح ان کے دیگر افسانوں میں بھی اس طرح کے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کے اکثر افسانوں کے کردار اسی طرح وجود میں آتے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ افسانہ ''سمادھ کا بھوت'' میں ستیہ بالا کو دادی شراب دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ ہر جنم میں بیوہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس کے تین جنم دکھائے گئے ہیں جن میں وہ بطور بیوہ نظر آتی ہے لیکن

تیسرے جنم میں میر صادق اسے شادی کرنے سے روکتا ہے۔گویا افسانے میں ایک طلسماتی کائنات نظر آتی ہے جس میں محیرالعقول واقعات رونما ہوتے ہیں۔اقتباس:

''یکا یک مجھے اپنے سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک سفید اور لطیف سا دھواں دکھائی دیا۔میں تعجب سے اس کو دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ دھواں سمادھ کی طرف بڑھنے لگا۔۔۔اس دھویں کا حرکت کرنا تھا کہ خود بخود میرے پاؤں کو جنبش ہوئی۔کوئی نامعلوم قوت مجھے اس طرف کھینچ رہی تھی۔''(سمادھ کا بھوت،صدائے جرس،صفحہ 59)

اس اقتباس سے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کے افسانوں میں زیادہ تر کردار کسی آفاقی دنیا سے وابستہ ہوتے ہیں جن میں زیادہ تر بھوت پریت وغیرہ شامل ہیں۔ان کے افسانوں میں ہیبت ناک واقعات جگہ جگہ رونما ہوتے ہیں جس سے ان افسانوں میں خوف ودہشت کا ماحول نظر آتا ہے۔شاید اسی لیے اختتامیہ میں شوکت تھانوی لکھتے ہیں کہ ان افسانوں کو رات کے وقت نہیں پڑھنا چاہیے۔اکثر افسانے ان کہانیوں کی بازگشت معلوم ہوتے ہیں جو داستانوں میں نظر آتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کے افسانے داستان کی ہی ایک دلچسپ صورت ہے تو زیادہ بہتر رہے گا۔افسانے ''زیتون'' میں کردار حبیب بھی داستانوی ہیرو کی طرح کسی خیالی صورت پر عاشق ہوجاتا ہے اور اسی خیالی صورت سے ہی شادی کرنے کی ضد کرتا ہے۔ان کے تمام تر افسانوں میں بھوت اور پریوں کے کردار لازمی ہیں بلکہ ان افسانوں کی تمام تر کہانی انہی کرداروں کے اردگرد گھومتی ہے۔افسانہ ''ارواح خبیثہ'' میں کچھ ایسا ہی کردار دیکھنے کو ملتا ہے۔اس افسانے میں فاخرہ نام کے کردار کے ہمشکل ایک روح جو اس قلعہ میں رہتی ہے۔یہ اکثر بھٹکتی رہتی ہے جس کی وجہ سے فاخرہ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اسی طرح افسانہ ''صدائے جرس'' میں بھی ایک مردہ لڑکی نوجوانوں کو اپنے قابو میں کر کے ان کا قتل کردیتی ہے اور ان کا خون پی جاتی ہے۔یہ افسانہ اصل میں مصر کے ان تابوتوں کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی ہے جن میں آج سے ہزار سال پہلے کے مردہ جسم پائے گئے۔اسی طرح ان کے بہت سے افسانے جن میں ''معلم کا راز'' جس میں ایک اژدھا انسانی قبح میں آکر سکینہ سے شادی کرتا ہے، افسانہ ''گلنارہ'' میں شجاع کی دوسری بیوی شہزادی مر کر بھوت بن جاتی ہے، افسانہ ''لاشوں کا شہر'' میں پاتھری گاؤں کے وہ تمام لوگ جن کو سلطان خان نے دھوکے سے قتل کیا، بھوت بن جاتے ہیں، افسانہ ''ایفائے عہد'' جس میں اورنگ زیب کے زمانے کی ایک عورت شمس النہار بیگم کی آتما اپنے شوہر کی میت کو اپنے آبائی قبرستان میں دفنانے کے لیے بھٹکتی رہتی ہے۔اس کے علاوہ دیگر افسانوں میں بھی اس نوعیت کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔افسانوی مجموعہ ''لاشوں کا شہر'' کا پہلا ہی افسانہ دیکھیے اس میں ایک راکھشس جس کا نام ''برلاس'' تھا افسانے کے پورے کینوس پر چھایا ہوا ہے۔یہ راکھشس پہلے کملا اور پھر زرینہ کے شوہروں کا قتل کرتا ہے۔جب زرینہ کا بھائی کملا کو شادی کرنے کے لیے کہتا ہے تو راکھشس اس کو بھی مارنے کے لیے آتا ہے۔افسانہ ''راکھشش'' سے ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

''جب تک ہم دونوں کمرے میں کھڑے رہے راکھشش باہر جھروکے سے ہمیں دیکھ کر دانت پیستا رہا۔اور اندر نہ آسکا کیوں کہ تمام دروازوں پر تعویذ لگے ہوئے تھے۔اس شام زرینہ اسی راکھشش کو دیکھ کر بیہوش ہوگئی تھی۔''

(راکھشش،لاشوں کا شہر،صفحہ 21)

مسز عبدالقادر نے اگرچہ مافوق الفطری عناصر کو اپنے افسانوں کا ایک اہم جزو بنایا لیکن باوجود اس کے مصنفہ اپنے فن سے قاری کو ان افسانوں کی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔اگر ان کے فن کی طرف نظر دوڑائی جائے تو یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ان کے افسانے فنی اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ ہیں۔انھوں نے اگرچہ مافوق الفطری

کرداروں سے کام لیا ہے لیکن ان کرداروں نے بھی ان کے افسانوں کو نکھارنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔قاری یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ایک طلسماتی کہانی ہے، اپنے آپ کو افسانے سے الگ نہیں کر پاتا بلکہ اول تا آخر اس کے پیچ وخم اور طلسماتی دنیا میں محو ہو جاتا ہے۔ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع اصلاحی ہوتا ہے۔ہر افسانے میں مرکزی کردار برے کردار کا پتلا ہوتا ہے جس کو بعد میں کسی آفاقی قوت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ہر ایک افسانے میں پہلے برائیوں کو دکھایا گیا بعد میں ان برائیوں کے مطابق ان کے برے نتائج بھی پیش کئے گئے ہیں ایسا لگتا ہے کہ مسز عبدالقادر خوف ناک طریقے سے قاری کو کسی گناہ سے ڈرا رہی ہیں جس سے قاری کے ذہن میں نہ صرف اس گناہ کا بدترین نتیجہ آنکھوں کے سامنے رقص کرتا نظر آتا ہے بلکہ اس گناہ کا بدلہ کسی راکھشس یا بھوت کے ذریعے دکھا کر یہ نتیجہ زیادہ وحشی اور دردناک معلوم ہوتا ہے۔افسانہ ''داغِ مصیبت'' اس کی ایک بہترین مثال ہے۔اس کا مرکزی کردار امرت بابو جو اگرچہ پیشے سے ایک پروفیسر ہوتا ہے لیکن یہ کردار نہایت ہی عیاش اور دھوکہ باز انسان ہوتا ہے۔انھوں نے گرلز کالج اس لیے چن لیا تھا کہ وہاں وہ خوبصورت لڑکیوں سے چھیڑ خانی کر سکے۔انھوں نے اپنی بیوی کو بھی دو دھکے سے مارا تھا۔ان تمام گناہوں کے بدلے اس کے ہاتھ پہ ایک ناگہانی داغ نمودار ہو جاتا ہے جس میں ہر چاند گرہن کی رات درد پیدا ہو جاتا ہے جو بعد میں ناسور بن جاتا ہے۔اسی طرح افسانہ ''لاشوں کا شہر'' میں بھی کردار سلطان خان کچھ انھی صفات کا مالک ہے وہ ایک قبیلے کا سردار ہوتا ہے لیکن اصل میں یہ حق ہمدان خان کا ہوتا ہے جس کو سلطان خان نے دھوکے سے مار ڈالا تھا اور اس کا تخت چھین لیا تھا اور ساتھ ہی ہمدان خان کے ماننے والوں کو بھی مار دیتا ہے۔وہ بھی عیاش تھا، لڑکیوں کو خرید کر ان کے ساتھ ناجائز تعلق رکھ کر آخر میں ان کو بھی قتل کر دیتا ہے۔یہ سب جن کو سلطان خان نے مارا تھا بھوت بن کر سلطان خان کو ایک خوف ناک انجام تک پہنچاتے ہیں۔افسانہ ''لاشوں کا شہر'' سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''سلطان خان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔وہ ابھی غشی کی حالت میں تھا۔لیکن کچھ دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو انگڑائی لے کر ستون کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔جب اس کی نظر سامنے دیوار کے ساتھ کھڑی لاشوں پر پڑی تو لڑکھڑا کر گر پڑا۔آنکھیں پتھرا گئیں اور رنگ جو پہلے زرد تھا، نیلا ہو کر مرجھا گیا۔اس کی گنہگار روح جسم سے علیحدہ ہو چکی تھی۔''

(لاشوں کا شہر صفحہ 11-110)

اسی طرح دیگر افسانے جیسے بلائے ناگہانی، پاداش عمل، صدائے جرس، آوارگون، معلم کا راز وغیرہ میں اس طرح کے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔افسانہ بلائے ناگہانی میں کردار ایک قبیلے کو ہلاک کرواتا ہے تو آخر میں اسے ایک درندا شیر مار دیتا ہے اسی طرح افسانہ پاداش عمل میں اسلم جو اپنی عیاشی کے خاطر اپنی وفادار بیوی کو چھوڑ دیتا ہے آخر میں یہ بھی عذاب میں مبتلا ہو کر مر جاتا ہے۔صدائے جرس میں وحشی نوت، آواگون میں رائے بہادر لالہ امرناتھ، معلم کا راز میں خات احمد اپنے گناہوں کی سزا پاتے ہیں۔یہ تمام کردار اخلاقی درس کے باب کو پیش کرتے ہیں جن کو پڑھ کر قاری نہ صرف خوف زدہ ہوتا ہے بلکہ اپنے اندر ایک اصلاحی لہر کی سرسراہٹ بھی محسوس کرتا ہے۔گویا ان کے تمام تر افسانوں میں اصلاحی پہلو غالب نظر آتا ہے شاید اسی کے پیش نظر مصنفہ نے مافوق الفطری کرداروں سے افسانے کے اس پہلو کو استقامت بخشی۔الغرض ان کے افسانوں پر طلسماتی کرداروں کی حکومت نظر آتی ہے۔

منظر کشی کی بات کی جائے تو اس حوالے سے مسز عبدالقادر اپنے افسانوں میں مناظر کی مکمل تصویر کشی کرتے ہوئے نظر آتی ہیں۔انھوں نے جس شے کو قلمی زبان عطا کی وہ جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتی ہے۔انھوں نے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے جزو کو ایک بہترین مصور کی طرح کینوس پر اتارا ہے۔چاہے کشمیر کے پہاڑوں کا ذکر ہو یا مصر کے ریتیلی میدانوں کا ہر جگہ ان کے قلم نے منظر کشی کے جوہر دکھائے۔باریک بینی سے ہر چیز کا پہلے مشاہدہ کرتی ہیں بعد میں اس کی ہو بہو تصویر قاری کے سامنے پیش کرتی ہیں۔اس میں ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے کرداروں اور ان پر گزرتے ہوئے حالات کی مناسبت سے منظر کشی کی ہے جو ان کا منفرد طرز اظہار ہے۔یعنی اگر کردار کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو موسم بھی اس کی لاچارگی کی گواہی دیتا ہے۔پوری فضا مایوس اور بے رنگ دکھائی دیتی ہے، جس سے قاری بھی کسی حد تک اس کے غم و الم کا شریک بن جاتا ہے۔ان مناظر سے افسانہ پرلطف اور مکمل نظر آتا ہے۔جہاں ان افسانوں میں بھوت پریت کرداروں کی وجہ سے یہ افسانے ڈراونے خواب کی مانند لگتے ہیں وہی خوفناک قلعوں کی منظر کشی اس خوف میں شدت پیدا کرتی ہے۔ویران کھنڈر اور اس پر کٹتے سروں سے بہتا خون افسانے کو ہولناک بناتا ہے۔افسانہ ''ارواح خبیثہ'' میں قلعہ رلّو کی منظر کشی کچھ اس طرح بیان کرتی ہیں:

''میں فطرتاً دلیر اور نڈر تھا۔نہ معلوم کس خیال کے زیر اثر میں بڑے دروازے سے ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔یہ پرانی طرز

کی ڈیوڑھی بہت طویل تھی جس کے پہلوؤں پر بہت سے چھوٹے چھوٹے دروازے تھے۔مدت دراز تک بند رہنے سے اس کی ہوا متعفن ہورہی تھی۔میں سامنے کے بڑے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔اس کے اندر ایک وسیع اور منقش ہال تھا جس کی چھت کے درمیان پرانے زمانے کا بہت بڑا بلوّرین جھاڑ لٹک رہا تھا۔اور اُس کے ہنڈولوں میں بے شمار کافوری شمعین روشن تھیں۔"

(ارواحِ خبیثہ،صدائے جرس،صفحہ 68-167)

افسانہ" پاداش عمل میں قلعہ روہتاس کا منظر بھی کچھ اسی طرح سے کھینچا گیا ہے جس میں پورے قلعے کی ایک تصویر قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس قلعے میں بھی بھٹکتے ہوئے ارواح نظر آتے ہیں ساتھ ہی قلعے کی خوفناک حالت بھی اس میں مزید شدت پیدا کرتی ہے۔دوسرے افسانے جیسے "راکھشش "میں اس ہیبت ناک راکھشس اور ساتھ ہی اس ویران کینوس کی تصویر بھی آنکھوں کے سامنے گھومتی نظر آتی ہے جس میں یہ راکھشس قید تھا،افسانہ "گلنار" کے آخر میں ویران اور خوف زدہ رات میں شہزادی کا بھوت بن کر زندہ نمودار ہونا اور افسانہ "صدائے جرس" میں بھوتوں کے وہ خوفناک غار جس میں وہ مردہ لوگوں کو رکھتے ہیں وغیرہ جیسے بہت سے مقامات دیکھنے کو ملتے ہیں جہاں پر مصنفہ نے منظر کشی کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔افسانہ "ایفائے عہد" میں گورستان کا منظر کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

"ہوا خوفناک آواز کی سرسراہٹ کے ساتھ ناگوار گونج پیدا کررہی تھی۔خشک پتوں کی چُرمُڑ کی صدا سے روحوں کے چلنے پھرنے کا گمان ہوتا تھا۔ایک ٹنڈ منڈ کے درخت کے سوکھے تنے کی کھوکھ میں سوئے ہوئے گنجے سردانے گدھ روشنی پڑتے ہی لمبی لمبی گردنیں باہر نکال کر ہمیں دیکھنے لگے۔ٹارچ کی جھلملاتی ضو میں ہمارے سائے لمبے اور ڈراونے ہورہے تھے۔سہمی ہوئی فضا میں قبریں خوف سے سکڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ہم محسوس کرنے لگے کہ مُردے اپنی بے نور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں قبروں سے گھور رہے ہیں اور ابھی اپنے استخوانی ہاتھ بڑھا کر ہمیں پکڑ لیں گے۔"

(ایفائے عہد،صدائے جرس،صفحہ 98-97)

ان تمام خوفناک مناظر و واقعات کے علاوہ خوبصورت پہاڑوں ،آبشاروں اور سبزہ زاروں کی بھی مصنفہ نے عمدہ تصویر کھینچی ہے۔جہاں انھوں نے وادئ کشمیر کے خوبصورت اور دلکش نظاروں کے مناظر پیش کیے ہیں وہیں اُن مقامات سے گزرنے والے کرداروں کے ساتھ ساتھ قاری بھی اس پر لطف فضا سے مسرت محسوس کرتا ہے۔ان کے اکثر افسانے اس طرح کے مناظر پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔یہی کمال ان کے افسانوں کو جاودانی عطا کرتا ہے۔اس طرح کی عمدہ مثالیں افسانہ معلم کا راز، لاشوں کا شہر، آواگون، بلائے ناگہانی میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔افسانہ" آواگون "میں لطیف کے ذریعے اس تمام پہاڑی علاقے کی ہو بہو تصویر پیش کی گئی ہے اسی طرح افسانہ"لاشوں کا شہر" کا مرکزی کردار بھی ایک بہترین انداز میں پورے مناظر سے قاری کو مسرور کرتا ہے۔گویا مسز عبدالقادر کے افسانوں میں نہ صرف ڈراونے قلعوں اور غاروں کی منظر کشی دیکھنے کو ملتی ہے بلکہ مختلف حسین اور خوبصورت مناظر سے قاری کو متاثر بھی کراتی ہیں۔

ابتدائی اوراق میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کے افسانوں میں داستانوی رنگ ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی پہلو بھی کارفرما نظر آتا ہے جو ان کے افسانوں میں بالکل واضح اور عیاں ہے۔ان تمام تر خوبیوں کے علاوہ ان کے افسانوں کی ایک اور خوبی تہذیبی عناصر ہے جو ان کے افسانوں کا ایک اہم پہلو بن جاتا ہے۔مصنفہ نے اپنے تمام تر افسانوں میں ہندی تہذیب کو ہی پیش کیا ہے۔ہر ایک افسانہ تہذیب کی مکمل لڑی معلوم ہوتی ہے۔ان میں ہندی دیومالائی کہانیاں اور ان میں رچی بسی تہذب سے مصنفہ نے بے شمار اوراق سیاہ کیے ہیں۔ان کے بیشتر افسانوں میں اساطیری عناصر کے عمدہ کردار اور مناظر نظر آتے ہیں۔افسانہ "راکھشش "اسی اساطیری تہذیب کی ایک بہترین مثال ہے جس میں ایک راکھشش ہوتا ہے جس کو کسی زمانے میں شوجی نے اپنے منتر سے قید کیا ہوتا ہے۔اس افسانے میں شوجی کے اساطیری پہلو کو پیش کر کے پوری ہندو تہذیب کو قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔اسی طرح کے بے شمار واقعات ایسے ہیں جہاں پر مصنفہ نے قدیم اور جدید زمانے میں تہذیب کی کارفرمائی کو دکھانے کی سعی کی ہے۔افسانہ "منوہر" میں بھی مشترکہ تہذیب کو دکھانے کی کوشش کی گئی۔رکمنی اگرچہ ہندو عورت تھی مگر اُس کی بیماری ایک فقیر کے دیے ہوئے تعویذ سے دور ہو جاتی ہے۔اسی طرح منوہر جو کہ رکمنی کا اندھا لڑکا ہے اصل میں ہندو جوگی ہوتا ہے جو رکمنی کے بیٹے کے روپ میں دوبارہ جنم لیتا ہے۔یہ کردار پورے ہندوستانی اساطیر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔مصنفہ کے دوسرے افسانوں میں بھی اسی طرح کے ہندوستانی اساطیری پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں افسانہ "آواگون" اس حوالے سے ایک اہم افسانہ ہے۔یہ افسانہ ابتدا سے آخر تک

تہذیب کی قوس وقزح ہے۔جس میں ہر موڑ پر مشترکہ تہذیب کی عمدہ مثال ملتی ہے۔اس کا ہر ایک کردار پُر جنم لیتا ہے جس کی وضاحت کردار شانتی کی کہانی سے ہوتی ہے۔شانتی پچھلے جنم میں ایک پجاری کی بیٹی ہوتی ہے جس کا نام ''چمپی'' ہوتا ہے۔افسانہ''آواگون'' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''مندر کے دائیں جانب ہمارا چھوٹا سا گئوشالہ تھا اور بائیں جانب ہماری سکونت کے لیے کوٹھڑی بنی تھی۔مندر کے پچھواڑے کی زمین میں میرا باپ کھیتی باڑی کرتا تھا۔یہاں سے دومیل کے ایک ندی تھی۔۔۔اور گاؤں کے لوگ بھی اسی راستے ہر مہینہ کے نوچندی اتوار کو اس مقدس جھیل میں اشنان کرنے آتے۔''(آواگون،لاشوں کا شہر،صفحہ 19۔118)

اس طرح کی بے شمار مثالیں ان کے افسانوں میں ملتی ہیں جن میں یوم محبت ،صدائے جرس ،سادھ کا بھوت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔گویا مسز عبدالقادر نے ہر اعتبار سے اپنے افسانوں میں ایک انوکھا پن برتنے کی کوشش کی ہے۔جس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئی ہیں۔

اگر چہ ان کے بیشتر افسانوں میں بعض خامیاں نظر آتی ہیں لیکن کچھ ایسے بھی افسانے ان کے قلم سے تخلیق ہوئے ہیں جنھیں اردو کے نامور افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ان کا واحد افسانہ''یوم محبت'' اس کی بہترین مثال ہے۔یہ افسانہ ہر اعتبار سے مکمل اور پائیدار افسانہ ہے۔اس میں ناصر اور ہاجرہ کی داستان پیش کی گئی ہے۔ہاجرہ جو بچپن میں نابینا تھی ساتھ ہی جونفسیاتی طور پر شادی کی خواہاں تھی۔ناصر اسے یہ کہہ کر دھوکا دیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرے گا لیکن آخر میں وہ ہاجرہ کو حاملہ بنا کر چھوڑ دیتا ہے۔لیکن افسانے کے آخر میں ایک بہترین انداز میں اس بات کا خلاصہ سامنے آ جاتا ہے کہ ناصر کی موجودہ بیوی ہی اصل میں ہاجرہ تھی۔اس افسانے کے کردار زمین سے جڑے رہتے ہیں۔ان کا تعلق سماج کی تلخ حقیقتوں سے ہوتا ہے۔جس میں ایک کم سن لڑکی کی نفسیات کو بھی دکھایا گیا ہے۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''یہ الفاظ کیا تھے،ایک برچھی تھی جو میرے دل کے پار ہوگئی۔مجھے اس وقت اپنی انتہائی ذلت کا احساس ہوا۔میں اکثر سوچتی کہ میری ساری عمر یونہی رنج وآلام میں گزرے گی۔کوئی آنکھوں والا مجھ اندھی سے کیوں شادی کرنے لگا۔ بس یہی ایک خیال تھا جو دن رات میرے دماغ میں چکر لگاتا رہتا۔''

(یوم محبت،لاشوں کا شہر،صفحہ 78۔177)

مجموعی طور پر اگر ان کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو بیشتر افسانوں میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں بھی نظر آتی ہیں جیسے پلاٹ کا بوجھل ہونا،کرداروں میں آفاقی قوت جس سے کہانی زمینی سطح سے اُٹھ کر ہوا میں اُڑنے لگتی ہے۔اسی طرح کرداروں کا ایک سے زائد مرتبہ افسانے کے کینوس پر نمودار ہونا کہانی میں افسانوی چاشنی کو زائل کرتا ہے۔ساتھ ہی ان کے افسانوں کے مرکزی کردار کسی ذہنی تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں ۔یہ کردار پہلے اپنی گزشتہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو دل کے تہ خانوں میں مقفل رکھتے ہیں لیکن آخر پر اس غبار کو بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں جو افسانے کا مرکزی پلاٹ بن جاتے ہیں۔علاوہ ازیں کہانی سے کہانی پیدا کرنے سے تسلسل اور وحدت تاثر بکھر جاتا ہے۔شاید اسی وجہ سے ان کے افسانوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔لیکن باوجود ان خامیوں کے، ان کے افسانوں کی اہمیت کا اندازہ شوکت تھانوی کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے:

''اس کتاب کو رات کے وقت نہ پڑھنا چاہئے تھا اچھی خاصی ہیبت ناک کہانی ہے۔مگر دلچسپ اس قدر ہے کہ خوف دلچسپی میں دب کر رہ جاتا ہے۔زبان بھی اچھی ہے اور بیان بھی بہت اچھا۔''(لاشوں کا شہر،صفحہ 84۔183)

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسز عبدالقادر افسانوی دنیا کی ایک ایسی قلم کار گزری ہیں جنھوں نے داستانوی طرز کو افسانوں میں رواج دینے کی حتی الامکان کوشش کی ہے لیکن اس طرز اظہار میں وہ زیادہ کامیاب نہ ہو پائیں۔ان کے افسانے خوف و دہشت سے بھرپور ہیں بلکہ ان کے افسانوں میں ہر جگہ بھوت اور راکھشس نظر آتے ہیں ان کا یہ طرز اظہار ہی ان کو افسانے کی اس بھیڑ میں ایک الگ مقام عطا کرتا ہے۔ان کے افسانوں میں اخلاقی،تہذیبی،مذہبی،انسان دوستی غرض ہر نوعیت کے درس دیکھنے کو ملتے ہیں۔جہاں وہ اخلاق کو درست کرنے کا درس دیتی ہیں وہیں تہذیب کے بہت سے پہلوؤں سے بھی قاری کو آشنا کرتی ہیں۔منظر کشی اور طرز اسلوب کے اعتبار سے بھی یہ افسانے مکمل نظر آتے ہیں۔مگر افسوس ان کے فن اور شخصیت کو سرے سے ہی نظر انداز کیا ہے جبکہ اُن پر مزید تحقیقی کام کی گنجائش ہے۔

Mudasir Ahmad Ganie
Research Scholar
University of Hyderabad
Gachibowli,
Hyderabad-500046 (T.S)

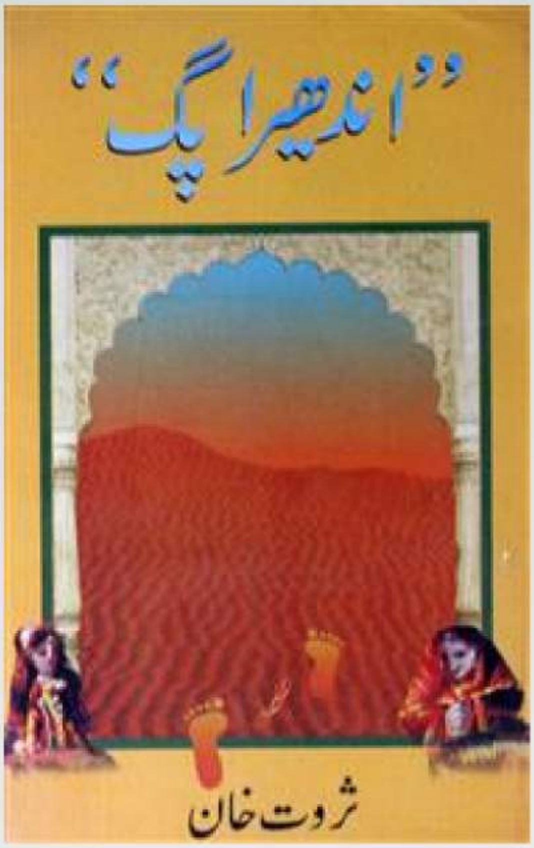

ڈاکٹر جنتی جہاں

ثروت خان کا ''اندھیرا یگ''

ثروت خان کا ناول ''اندھیرا یگ'' پہلی بار 2005 میں اور دوسرا ایڈیشن 2015 میں منظر عام پر آیا انھوں نے راٹھور، راجپوت اور برہمنوں کی کہانی پیش کی ہے۔ راجستھان کا وہ حصہ جو بیکانیر سے کوئی پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ''دیش نوک'' نام کا قصبہ ہے۔

ناول کا مرکزی کردار روپی ہے۔ روپی کی پھوپھی راج کنور، پھوپھا دیوندر، والد پنڈت رتن سنگھ اور والدہ سبھدر دادی ماتیشوری، دادا بشن سنگھ، چاچا سدرشن سنگھ، راج کنور کے دو بیٹے روی، اشوک بھائی کے بیٹے جوگیندر پریم سنگھ، روپی کی دوست رمیا اور کسم، ڈرائیور کشن، بشن سنگھ، پریم سنگھ، انوپ مہندر پرتاپ روپی کا شوہر دوجے سنگھ، حلوائی سکھی رام، روپیشور سنگھ، رینو، اللہ رکھا، پرمیلا، رفیق دین، امام الدین، روپی سسر پنڈت شورویر سنگھ اور ساس، گنجی بڑھیا وغیرہ، راج کمار روپی سے محبت کرتا ہے لیکن کہہ نہیں پاتا۔ بھیلو، رانا چھمیا مالن، بھیرو، ڈالی ملازمائیں رونی، دھونی، روپی کی چاچی وغیرہ۔ ان سب کرداروں کے ذریعہ یہ 140 صفحات کا ناول اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔

ثروت خان نے ایسے معاشرے کو موضوع بنایا ہے جو خاندانی روایتوں اور وراثتوں کی گرفت میں قید اور مجبور ہے۔ اس کہانی میں عورت کو مظلوم و بے بس حالات کی ماری ہوئی قدیم رسم و روایت میں جکڑی ہوئی اور اپنے اوپر طرح طرح سے ظلم سہتی ہوئی دکھایا گیا ہے۔

یہ کہانی ایک ایسے قصبے کی ہے جہاں عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے حقوق کے لیے یا مستقبل کے لیے آواز اٹھانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس قصبے کا ہر فرد اپنے بچوں کی اعلیٰ تربیت سے زیادہ حویلی، خاندان، زمین و جائیداد، شان و شوکت کی پرواہ کرتا ہے۔ یہاں پر لڑکیوں کی پڑھائی تو بالکل ہی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ تھوڑا بہت پڑھا کر ہی لڑکیوں کو گھر بٹھا لیا جاتا ہے اور اس کی شادی کی پرواہ ہونے لگتی ہے۔ جو عمر ابھی کھیلنے کودنے کی ہوتی ہے۔ اس عمر میں وہ لڑکیوں کو اس اندھیر نگری میں دھکیل دیتے ہیں جس سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

ان سب باتوں کا ذمہ دار گھر کا مکھیا ہوتا ہے۔ روپی کے والد کا ہی حکم ان کے گھر میں مانا جاتا ہے۔ اس ناول کو پڑھ کر یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ کہ ان روایتوں اور وراثتوں میں انسان کب تک قید رہے گا۔ آخر کار ایک نہ ایک دن ان روایتوں کی زنجیروں کو توڑنا پڑے گا۔ اگر سب یہی سوچتے رہیں کہ یہ ہمارے ملک کی یا سماج کی پرم پرایا روایت ہے تو سب کی بیٹیاں ہی روپی کی طرح اپنے ارمان اور مستقبل کا گلا گھونٹتی رہیں گی۔ یہ سب سے بڑی کمی ہمارے بزرگوں یا پھر والدین کی ہوتی ہے۔ جو راج کنور اور روپی جیسی تعلیم یافتہ لڑکیوں کی آواز کو بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں سماج میں ان جھوٹے رواجوں کے جال میں پھنسے رہتے ہیں۔

ناول نگار نے شہری زندگی کی بھی عکاسی کی ہے۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ گاؤں دیہات کے مقابلے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق والدین کو شہروں میں زیادہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ دیہات قصبوں سے اسی

لیے نکلتے ہیں کہ ان کے بچوں کی تربیت اچھی ہو سکے۔لیکن روپی جیسے خاندان والے صرف ایک ہی رٹ لگائے ہوئے ہیں پریوار ریتی رواج سماج معاشرہ ان کے بچوں کے مستقبل سے زیادہ قدیم رسم ورواج، زمین جائیداد، گاؤں کے سرپنچوں کی زیادہ پرواہ ہے۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ہم تو کچھ بن نہیں پائے ....چاہتے ہیں کہ اسے قصبے سے نکال کر شہر لے جائیں۔اونچی شکشا دلوائیں۔یہ ضرور ہمارے خاندان کا نام روشن کرے گی......دراصل بھائی سا! روپی میں ہم اپنی پرچھائیں دیکھتے ہیں''۔

(اندھیرا پگ، ثروت خان، روش پرنٹرس، دہلی، ص13)

''راج آخر تم سمجھتی کیوں نہیں۔ہمیں یہ سب کرنا پڑے گا ورنہ برادری سے باہر کر دیے جائیں گے .... اس کی پڑھائی کو لے کر پہلے سے ہی قصبہ کے لوگوں کا ورودھ جھیل رہے ہیں۔لوگ مذاق بنانے لگے ہیں کہ 'اب اس حویلی کی لگائیاں پنڈت بنیں گی۔''اور تم آگے پڑھانے کی بات کرتی ہو۔تمھیں معلوم ہے اس بات پر پنچایت تک بیٹھ سکتی ہے۔''

(اندھیرا پگ، ثروت خان، روش پرنٹرس، دہلی، ص14)

کیا لڑکیوں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا؟ کیا لڑکیوں کو اونچے اونچے سپنے دیکھنا یا ایسے خواب جس میں ڈاکٹر بن سکیں یا انجینئر بن سکیں، یا اپنی زندگی کا فیصلہ خود کر سکیں۔کیا اس سماج میں اس کی اجازت نہیں؟

اگر اس کی اجازت نہیں تو اس کا ذمہ دار کون ہے سماج یا پھر ہمارا اپنا پریوار، اپنے والدین۔آخر کار اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ان سب سوالوں کا ایک ہی جواب ہے اپنی فیملی۔اگر قدیم روایات کو نظر انداز کر کے سماج اور برادری کی پرواہ کیے بنا انسان اپنی منزل تلاش کرے تو اس کا راستہ خود بہ خود آسان ہوتا چلا جائے گا۔لیکن انسان سوچتا کب ہے۔روپی کے والد کو اگر برادری کا اتنا ہی ڈر تھا تو رونی، وہی رونی جو ایک وقت کی روٹی کے لیے ان کے گھر میں ملازمہ تھی اس کے ساتھ ایسی حرکت کیوں کرتا ہے؟ تب برادری کا خیال کیوں نہیں آتا؟ تب برادری سے باہر کرنے کا ڈر کیوں نہیں لگا؟ وہ اس لیے کہ وہ لڑکی غریب تھی اس کے ٹکڑوں پر پل رہی تھی اس کو معلوم تھا کہ یہ ہمیشہ خاموش رہے گی۔آخر کار رونی کو گہری نیند سلا دیا جاتا ہے۔

''کاہے ڈھونڈھتی ہے بہو! پگلی ہے تو.........سن......... تیرے سہاگ نے مروادیا ہے رونی کو......رتن سنگھ نے......اس کے ساتھ مر گیا اس کا بچہ بھی......دونوں کو گڑوادیا سوکھی باوڑی میں......''ماں!'' یہ پاپ ہے، مہا پاپ......''بہو پاپ پنے کیا ہے۔تم ابھی تک نہیں سمجھیں......؟ یہ سب تو ریتی رواجوں پر دھرم کی مہروں کے نام ہیں بس......اور کچھ نہیں۔''

(اندھیرا پگ، ثروت خان، روش پرنٹرس، دہلی، ص111)

اس غریب کی جان اتنی سستی تھی کہ اس کو زمین میں گاڑ دیا۔ایسے لوگوں کو دوسروں کی بیٹیاں بیٹی نہیں لگتی یہ تو ان کو ہوس پرست نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔یہ رونی کا المیہ ہی نہیں ہے نہ جانے روز رونی جیسی کتنی معصوم ان درندوں کے چنگل میں آکر اپنی جانوں کی قربانیاں دیتی ہیں۔یہ عورت کا سب سے بڑا المیہ ہے۔عورت کی عزت ہی اس کی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔ان درندوں کو یہ بتا دینا چاہیے کہ یہ صرف عورت نہیں ہے یہ عورت کے روپ میں کسی کی ماں، بیٹی اور بیوی ہے تو کسی کی بہن ہے۔

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی بچیوں پر کس طرح سے ظلم ہو رہے ہیں۔اگر کسی کی بیٹی بیوہ ہو گئی تو اس کو کتنی گالیاں اور تانیں سننے پڑتے ہیں۔اس عہد کی کہانی ہے جب عورتوں کو ستی ہونا پڑتا تھا یا پھر ایک کال کوٹھری میں اکیلے بند رہنا ہوتا تھا۔کہیں کہیں یہ رواج آج بھی برقرار ہے۔جو مصنفہ نے دکھانے کی کوشش کی ہے راجستھان کی حقیقت ہماری آنکھوں کے سامنے عیاں ہو جاتی ہے۔والدین کی ایک غلطی اولاد کو کتنے بڑے امتحان میں ڈال دیتی ہے۔کس طرح سے لوگ خدا کی خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ جو اللہ کو منظور تھا وہ ہو گیا۔موت تو ایک نہ ایک دن آنی ہے۔

یہ اس روپی کی کہانی ہے جو شادی کے چار ماہ بعد ہی بیوہ ہو گئی تھی۔اب اس کو وہ ساری قدیم رسمیں نبھانی تھی جو برسوں سے چلی آرہی تھیں۔روپی کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔وہ تو سارے ظلم چپ چاپ ہی سہہ رہی تھی۔اس کی سننے والا کون اس کے ساتھ تھا۔اب بند کوٹھری میں اس کی زندگی گزر رہی تھی۔اس کی ساس اس پر طرح طرح سے الزامات لگاتی ہے، گالیاں دیتی ہے۔

''لیکن خاندانی وقار نے ان کو بیڑیاں پہنا رکھی تھی......روپی کو ڈاکٹر کی جگہ دلہن بننا پڑا۔''

(اندھیرا پگ، ثروت خان، روش پرنٹرس، دہلی، 40)

''آنکھیں تریر کر روپی کے بازو پکڑا اور تقریباً اسے گھسیٹتے ہوئے دانت بھینچ کر کہا ''اب اس سے اس کل موہی رانڈ کو کہاں لے جا رہی ہو۔آرام میں رکھ کر کیا اس کے سوئے

ہوئے ارمان جگانے کا پھر ارادہ ہے۔''

(اندھیرا پگ، ثروت خان، روش پرنٹرس، دہلی، ص44)

''آتے ہی ڈائن دو ہی مہینے میں میرے بیٹے کو کھا گئی۔اب اور کھانے کو کیا بچا ہے......ابھاگن سے کہا تھا ستی ہو جا ......نشہ کر کے بیٹھ جاتیچا میں.....پتہ بھی نہیں چلتا......ایک ہی بار میں پاپ سے چھوٹ جاتی۔''

(اندھیرا پگ، ثروت خان، روش پرنٹرس، دہلی، ص45)

کس کس طرح سے روپی کو اذیت پہنچائی جا رہی تھی۔یہ ستی پرتھا کا رواج ایسا دکھایا ہے کہ بنا آنکھیں نم ہوئے نہیں رہا جاتا۔سارا قصور اس معصوم روپی کا ہی بتایا جاتا ہے قصور تو روپی کے والد کا تھا جو بچپن میں ڈاکٹر کے ایرین کی جگہ شادی کا بھاری جوڑا پہنا دیا گیا جس کا بوجھ روپی نہیں اٹھا سکتی تھی۔

اس ناول میں اس قصبے کی عکاسی کی گئی ہے جس میں ہسپتال تک نہیں ہے۔عورت ماں بننے کے وقت ہی دم توڑ دیتی ہے۔بھیروں کی بیوی ڈالی کسی امید سے تھی قصبے میں ڈاکٹر نہ ہونے کی وجہ سے شہر جا رہے تھے۔وقت زیادہ ہونے کی وجہ سے دردزہ میں تڑپ کر گہری نیند سو جاتی ہے۔جب یہ پرانی روایتوں پر چلنے والے لوگ بچوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرائیں گے تو نہ جانے ڈالی جیسی کتنی عورتیں تڑپ تڑپ کر اپنی جانیں گنوا دیں گی۔سب کو سوچ بدلنی ہوگی تبھی ہر گاؤں، دیہات، قصبہ ترقی کر پائے گا۔ایک عورت کی معصومیت اور لاچاری اس طرح نظر آتی ہے۔

''بھیرو نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ڈالی کا سر ماں کی گود میں تھا.....اور ماں.....جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بہو سے کہہ رہی تھی ....لاڈی ......او...... .لاڈی.....کائیں ہو گیو........ کاتیں ہو گیو........ باپڑی..........کچھ بولے کیوں نی؟ ....اے مہاری لاڈی ......آنکھیا تو کھول ....!!ڈالی بیس منٹ کے مختصر سے سفر کو چھوڑ کر لمبی مسافت پر نکل چکی تھی۔'' (اندھیرا پگ، ثروت خان، روش پرنٹرس، دہلی، ص34)

کہیں نہ کہیں سرکاری افسران کی غلطیاں بھی رہتی ہیں جو گاؤں دیہاتوں پر کم توجہ مرکوز کرتے ہیں۔کہیں کہیں آج بھی دیکھا جائے تو سڑکیں تک موجود نہیں ہیں۔پانی بجلی، ہسپتال یہ سب گاؤں دیہاتوں میں کم ملیں گے۔اگر وقت پر ڈالی کا علاج ہو جاتا تو شاید ڈالی بچ جاتی۔اگر گاؤں دیہات، قصبوں کے لوگ عرضی بھی پیش کرتے ہیں تو اس کا بھی کوئی جواب نہیں ملتا۔ناول نگار نے انھیں حالات کی عکاسی کی:

''موتیابند کے مریضوں کا تو کنبہ ہی نہیں پورا محلّہ آباد ہو گیا تھا رتن سنگھ نے بھنراج سے کہہ کر شہر سے لائنس کلب تک اپنی عرضی بھیج رکھی تھی کہ کبھی یہاں کیمپ لگائیں تو وہ ڈھائی سو آپریشن کا کوٹا ہے۔اس کیمپ کی راہ تکتے تکتے لوگوں کی بچی کچی روشنی بھی ماند پڑنے لگی تھی۔بجلی پانی کا بھی یہی حال تھا۔'' (اندھیرا پگ، ثروت خان، روش پرنٹرس، دہلی، ص34)

اس ناول میں ہر کردار کے اپنے الگ الگ مسائل ہیں۔رمیا ہے روپی کی دوست جو بچپن میں ہی دلہن بن گئی تھی۔لیکن کچھ ہی دن کے بعد اس کا شوہر کسی کے ساتھ اس کو بیچ دیتا ہے۔راجستھان میں یہ بھی عام ہے کہ عورتوں کو کچھ دن رکھ کر بیچ دیا جاتا ہے۔

روپی کی پھوپھی راج کنور ہے جو اپنے اندر ارمان لیے ہوئی تھی۔وہ خود بھی پڑھنا چاہتی تھی لیکن جلدی شادی کر دی گئی پھر اپنی بھتیجی کو ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی۔وہ ارمان بھی پورا نہیں کر پائی اور اپنی حسرتوں وتمناؤں کو لئے اس جہان فانی کو الوداع کہہ دیا۔

روپی کے گھر میں ملازمہ رونی ہے جو بے قصور بے گناہ معصوم بچی پہلے ہوس کا نشانہ بنتی ہے اور پھر اپنے حقیقی خدا سے جا ملتی ہے اس کو بھی گہری نیند سلا دیا جاتا ہے۔روپی کی ماں ہے سبھدرا رانی جو ہمیشہ اندر ہی اندر گھٹتی رہتی ہے۔کبھی رونی پر ترس کھاتی ہے تو کبھی اپنی لاڈلی روپی یا پھر اپنی نند راج کنور کو یاد کرتی ہے۔ان سب کرداروں کے اپنے الگ الگ مسائل ہیں''اندھیرا پگ'' کے بارے میں پروفیسر علی احمد فاطمی''اس طرح رقمطراز ہیں:

''اس ناول کی یہی خوبی ہے کہ وہ قصہ تو پرانے خیالات کو لے کر چلتا ہے لیکن جذبہ اور نظریہ نئے خیالات کا ہے۔ناول ابھرتا ہے دونوں کے ٹکراؤ سے۔المیہ یہ ہے کہ فوری طور پر جیت پرانے خیالات کی ہوتی ہے لیکن یہ جو المیہ ہے یہی ناول کا رزمیہ ہے۔''[9]

(پروفیسر علی احمد فاطمی، مضمون اندھیرے سے اجالے کا سفر، اندھیرا پگ، ادبی افق کا روشن ستارہ، ثروت خان، روش پرنٹرس، دہلی، ص68)

□□□

Jannati Jahan
Jio Service Center
Ekta Vihar South
Moradabad-244001 (U.P.)

نعیمہ خانم سراج خان

برار کے افسانوی ادب کا ابھرتا فنکار

محمد علیم اسماعیل

زبان وادب اور علم وثقافت کے ارتقاء میں جہاں اردو کے کئی مراکز شاندار تاریخی روایات کے حامل ہیں وہیں علاقہ ودربھ بھی اپنی پیش رفت کی مثالیں اپنے تاریخ کے صفحات پر سجائے ہوئے ہے۔ودربھ میں اردو زبان کی مختلف اصناف کی نشونما میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کئی تخلیق کار کا شمار ہوتا ہے جن میں واجدہ تبسم،شفیقہ فرحت ،رفیعہ منظور الامین،میم۔ ناگ، عظیم راہی، مظہر سلیم، غنی غازی، کلیم ضیا، ڈاکٹر محبوب راہی، بانو سرتاج، ایم آئی ساجد، آغا غیاث الرحمٰن، ڈاکٹر قمر جہاں، سکندر عرفان وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

مہاراشٹر انتظامی، جغرافیائی، سیاسی اور ثقافتی لحاظ سے مختلف ڈویژن میں بٹا ہوا ہے۔ یہ ڈویژن امراوتی، اورنگ آباد، کوکن، ناگپور، ناسک اور پونے ہیں۔ ودربھ میں امراوتی اور ناگپور زیلی ڈویژن شامل ہیں۔ امراوتی ڈویژن کا پرانا نام ''برار'' ہے یہ ریاست مہاراشٹر کے شمال مشرق

میں واقع ہے ۔موجودہ دور میں اس علاقے میں گیارہ اضلاع شامل ہیں۔یہ اضلاع ہیں ناگپور ،وردھا،گڑھ چرولی، گوندیا، چندر پور، بھنڈارا، امراوتی، اکولہ، واشم، بلڈانہ اور ایوت محل۔ ودربھ کی سرحد پر واقع ہونے کے سبب ضلع بلڈانہ ”ودربھ دوار“ بھی کہلاتا ہے۔ بلڈانہ ضلع کے شہر کھام گاؤں، شیگاؤں، ناندورہ اور ملکا پور اردو کی تعلیم اور اردو زبان و ادب کے لیے مشہور ہیں۔شہر ناندورہ ابتدا ہی سے ادبی مرکز ہونے کے باوجود بھی غیر معروف رہا۔لیکن کچھ عرصے پہلے مختلف ادیبوں کے ذریعے کی جانے والی مسلسل ادبی سرگرمیوں نے اس شہر کی ایک ادبی شناخت قائم کی ہے۔۔

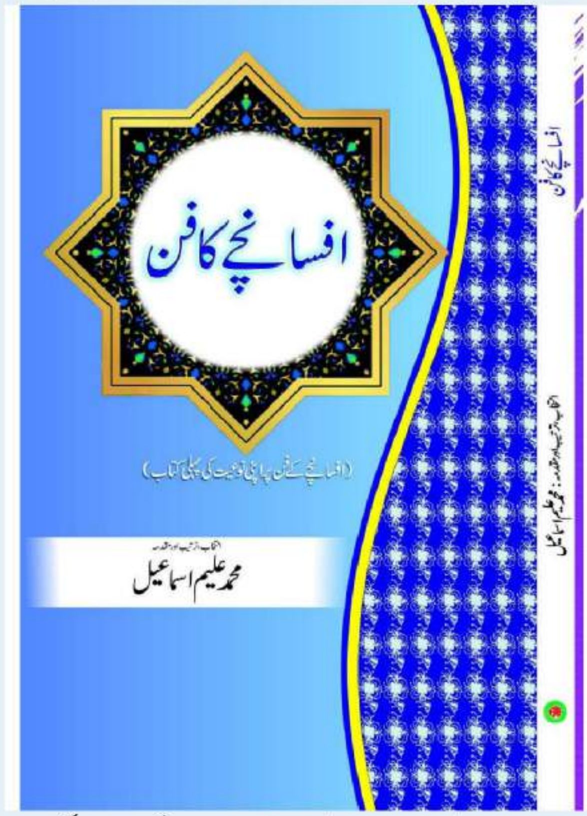

اردو ادب کے آغاز سے حال تک شہر ناندورہ میں کئی فنکار ہو گزرے ہیں اور جدید دور میں شہر ناندورہ کے ادبی افق پر کئی ستارے جگمگا رہے ہیں۔انھیں ستاروں میں اپنی پوری آب وتاب سے جگمگا تا ستارہ محمد علیم اسماعیل ہیں جو اردو ادب کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ محمد علیم اسماعیل نے اردو افسانوی ادب میں اپنے فکر وفن سے اپنی ایک علیحدہ شناخت قائم کی ہے۔موصوف کا قلم اردو زبان و ادب کی آبیاری میں مسلسل کوشاں رہتا ہے۔

محمد علیم اسماعیل 22 جون1982 میں بلڈانہ ضلع کے شہر ناندورہ میں پیدا ہوئے۔محمد علیم اسماعیل نے درجہ ہفتم تک نگر پریشد اردو اسکول ناندورہ اور جماعت ہشتم سے دسویں جماعت تک کی تعلیم عنایتیہ ہائی سکول و جونیئر کالج سے حاصل کی۔اس کے بعد بی ۔اے، ایم۔اے، بی۔ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔اور یو۔جی۔سی۔نیٹ،ایم۔ایچ۔سیٹ جیسے مشکل ترین امتحانات میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔اتنی ڈگریاں حاصل کر لینے کے اور ملازمت مل جانے کے بعد بھی انھوں نے کتابوں سے رشتہ استوار رکھا۔ پڑھنے لکھنے کا شوق انھیں بچپن ہی سے تھا اور کتابوں کے مطالعے کے اسی شوق نے انھیں ایک قلمکار اور افسانہ نگار بنا دیا۔اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایم ایس سی آئی ٹی کے آن لائن امتحان میں سو فیصد نمبرات حاصل کرنے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

آپ پیشہ سے ایک معلم ہے اور ریاست مہاراشٹر ضلع بلڈانہ ہی میں شعبۂ تعلیم ضلع پریشد بلڈانہ، میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔اب تک ان کی تین تصنیفات منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں دو افسانوی مجموعے” الجھن“اور” رنجش“اور ایک ترتیب شدہ مضامین کا مجموعہ” افسانچے کا فن“شامل ہے۔محمد علیم اسماعیل کی پہلی تحریر”علامہ اقبال کی باتیں“2013 میں اردو ٹائمز ممبئی میں شائع ہوئی۔اس مضمون کی پذیرائی نے ان کے حوصلے کو جلا بخشی۔اس کے بعد ان کا پہلا افسانہ”خیالی دنیا“2016 میں ممبئی اردو نیوز میں شائع ہوا۔2015 سے ہی موصوف نے افسانہ اور افسانچہ کے فن کو پڑھنا اور سمجھنا شروع کیا۔ افسانچے کے فن پر لکھی گئی متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا۔مختلف افسانچہ نگاروں کی تصنیفات کا گہرائی سے جائزہ لیا۔ ملک کے نامور افسانہ نگاروں سے رابطہ کر کے ان سے افسانچے کے رموز واوقاف سمجھنے کی حتی المقدور کوشش کی اور پھر اس صنف میں طبع آزمائی کرنے کی ابتدا کی اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ان کے افسانے اور افسانچے ہندو پاک کے متعدد ادبی رسائل و اخبارات میں متواتر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ 2020 میں علیم اسماعیل کو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے خصوصی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔اس کے علاوہ محمد علیم اسماعیل شہر ناندورہ کی ادبی تنظیم فکشن اسوسی ایشن کے صدر ہیں جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں مسلسل کوشاں ہیں۔

محمد علیم اسماعیل کی شخصیت کے متعلق قدرت ناظم ناندورہ نے کیا خوب کہا ہے!

”شوق کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ شرر ہاتھ آئے تو وہ ستارے کی طرف لپکتا ہے اور جب ستارے کی طرف رسائی ہو جائے تو وہ چاند پر کمندے ڈالنے میں سرگرداں ہو

جاتا ہے۔علیم اسماعیل بھی ان گونا گوں خوبیوں کے مالک ہیں۔ بڑی فعال اور ہمہ جہت شخصیت ہیں۔"

(کارشیشہ گری، مجموعہ"الجھن" قدرت ناظم، ناندورہ، صفحہ 13)

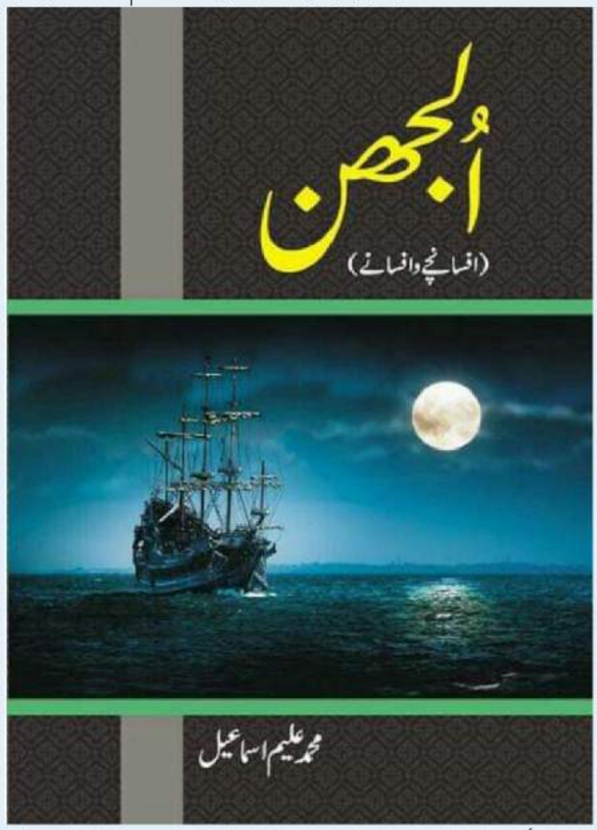

"الجھن" ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو 2018 میں شائع ہوا۔جس میں کل تیرہ افسانے اورساٹھ کے قریب افسانچے شامل ہیں۔2020 میں ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ"رنجش" زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ جس میں افسانوں کی تعداد اکیس (21)اور پانچ (5) افسانچے شامل ہیں۔اس مجموعے کے افسانوں میں 'چھٹی'، 'ادھورے خواب'، 'ریجیکٹ'، 'رنجش'، 'قصور'، 'جنون'، ان کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ تمام افسانے تاثر سے بھر پور ہیں جو قاری کے ذہن پر دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ محمد علیم اسماعیل ایک باصلاحیت قلم کار ہیں جو اپنے اطراف واکناف سے باخبر رہتے ہیں اور ایک اچھے فنکار کی خوبی ہے کہ وہ اپنے اطراف کے حالات سے باخبر رہے ۔لہذا علیم اسماعیل کو افسانہ لکھنے کے لیے موضوعات ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

"افسانچے کا فن" ان کی تیسری تصنیف ہے۔2021 میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ کتاب کے نام سے ہی واضح ہے کہ یہ افسانچے کے فن کے متعلق لکھی گئی کتاب ہے اور افسانہ نگار نے افسانچہ نگاری کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے کتاب کے عنوان کا حق ادا کرنے کی مکمل سعی کی ہے۔کتاب کا انتساب ڈاکٹر ایم۔اے۔حق صاحب کے نام ہیں۔ کتاب میں مضامین ،افسانچہ کے متعلق ،اقتباسات،تاثرات, اور منتخب افسانچوں کو شامل کیا ہے۔اس کتاب کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ افسانچہ کس طرح لکھا جاتا ہے؟ افسانچے میں کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے؟ سے بحث کی گئی ہے۔اس کے علاوہ موصوف نے اس کتاب کی تحریر کا سبب بھی اس میں درج کیا ہے اور اس میں پیش آنے والی دشواریوں کا ذکر بھی کیا ہے یہ کتاب نو آموز قلم کار کے لیے مشعل راہ ثابت ہوسکتی ہے اس کے علاوہ ان کی تین تصانیف زیر طبع ہیں جو بنام۔ (1)خاموش دھاکوں کی گونج (افسانچے)(2)دیوار پر بنی ہوئی تصویریں (افسانے)(3)اردو افسانہ اکیسویں صدی کی دہلیز پر(مضامین)

محمد علیم اسماعیل کے افسانے بیانیہ تکنیک میں لکھے گئے ہیں اور یہی ان کے فن کی نمایاں خوبی ہے۔ ان کا انداز بیان اور لب ولہجہ انفرادیت کا حامل ہے۔نہایت کم وقت میں انہوں نے افسانہ نگاری میں کئی تجربات کیے اور مختلف افسانوں میں راوی کی مختلف اقسام کا استعمال کیا۔ان کے افسانوں میں سماجی ،ثقافتی ،سیاسی اور نسائی پہلو کی عکاسی نظر آتی ہے۔ بعض افسانے اصلاحی نقطہ نظر کے حامل دکھائی دیتے ہیں جو افسانہ نگار کی معاشرے کے تئیں فکر کو اجاگر کرتے ہیں۔علیم اسماعیل کے افسانوں کا مطالعہ ہمیں اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ ان کے ذہن میں کچھ نیا کرنے کی لگن وجستجو, دل میں اصلاح کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے اور ان کے تحریروں سے ان کے جذبات، احساسات اور امنگوں کی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار سماج سے ختم ہوتی مثبت اقدار کے بھی متلاشی ہیں۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری ان کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

> "سماجی تعمیر وتشکیل میں جن مثبت اقدار کی ضرورت ہوتی ہے، اور جو، اب ہمارے معاشرے سے ختم ہوتی جارہی ہیں، علیم کے افسانے اور افسانچے ان کے ثبات میں کوشاں ہیں۔ جہاں تک ان کی تحریروں کو فنی کسوٹی پر جانچنے کی بات ہے تو میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ علیم فن سے واقفیت رکھتے ہیں۔"

("چنگاریاں ضرور ایک دن شعلہ بنے گی" از قلم اسلم جمشید پوری، مجموعہ"الجھن"،علیم اسماعیل، صفحہ 9)

جیسے جیسے محمد علیم اسماعیل کی تخلیقی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے وہ ہر خاص و عام میں بے حد مقبول ہو رہے ہیں بے شک اہل ادب جانتے ہیں کہ افسانچہ لکھنا کارشیشہ گری سے کم نہیں مگر موصوف نے اسی کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے اور بہترین افسانچے تحریر کیے ہیں جو مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مشہور افسانہ نگار ''نورالحسنین'' محمد علیم اسماعیل کی افسانہ نگاری کی خصوصیت کو کچھ اس طرح سے واضح کرتے ہیں:

''اس کے افسانے زندگی کی چھوٹی بڑی حقیقتوں کو نہایت روانی کے ساتھ پیش کرتے ہیں بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اس کے ہاتھ وہ سرا لگ گیا ہے جو فرد کے داخلی اور خارجی مسائل احساس و فکر کے کچوکوں سے جوجھتے ذہن ،سیاسی ہتھکنڈوں میں جکڑی ہوئی بے بسی، تنہائی کا کرب ،معاشی گھٹن، رشتوں کی پاسداری اور بے اطمینانی بھی، دکھ اور بیماریاں اور غیر محفوظ مستقبل کی وہ فکریں بھی، جس کا کرب چاروں طرف دکھائی دیتا ہے۔ بلا شبہ علیم ان موضوعات کو سلیقے سے برت رہا ہے۔''

(دیدۂ دل تو وا کرے کوئی'' از قلم نورالحسنین، مجموعہ ''رنجش''، علیم اسماعیل، صفحہ 10)

''چھٹی'' ایک ایسا افسانہ ہے پڑھ کر قاری بھی غمگین ہوتا ہے جبکہ افسانہ ''عقلمند'' ایک سبق آموز کہانی ہے۔ ''قصور'' افسانہ نگار کی ایک نمائندہ کہانی ہے جو افسانہ نگار کے پسندیدہ افسانوں میں سے ہے افسانہ'' رنجش'' دو دوستوں کے رشتوں پر مبنی کہانی ہے۔ ان کے افسانچوں میں ''پردہ''، ''مسکراہٹ''، ''مردہ پرستی'' قاری کو حقیقت سے قریب کر دیتے ہیں۔ مجموعہ ''الجھن'' کے افسانوں میں 'انتظار' میں ایک ٹیچر کے کرب کو بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ 'خوف ارواح' میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک بھائی اپنی بہن کی محبت میں کس حد تک جا سکتا۔ افسانہ 'تانک جھانک' ایک غریب بچے کی ٹوٹتی امیدوں کی پر درد کہانی ہے۔ افسانہ 'خیالی دنیا' میں موبائل اور وہاٹس ایپ کی خیالی دنیا میں وقت برباد کرنے کے بجائے حقیقی دنیا سے رشتہ قائم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

موصوف ایک متجسس طبیعت کے مالک ہیں۔ انھوں نے افسانچہ نگاری پر اچھی پکڑ حاصل کر لی ہے اور بہت ہی قلیل مدت میں کامیابی کی کئی منزلیں طے کی ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ ان کے فن میں مزید پختگی اور نکھار پیدا ہو اور وہ اردو ادب کے معتبر افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہوں۔ ان کا فن کامیابی کی بلندیوں کو چھو لے۔

اپنے اس مقالے کا اختتام میں قدرت ناظم نا ندورہ کے ان اشعار سے کرنا چاہوں گی۔ یہ اشعار موصوف کے عزم و حوصلے اور ان کی خصوصیت کی ترجمانی کرتے ہیں:

اس کو نزدیک جا کے دیکھا ہے
خوب جانچا ہے خوب پرکھا ہے
خاک کا ہو نہ ہو مگر ناظم
آدمی جستجو کا پتلا ہے

□□□

Naima khanam Siraj Khan
Research Scholar
Dr. BAMU
Aurangabad
Post: Sultanpur
Taluqa Lonar
Dist: Buldana-433102 (M.S)

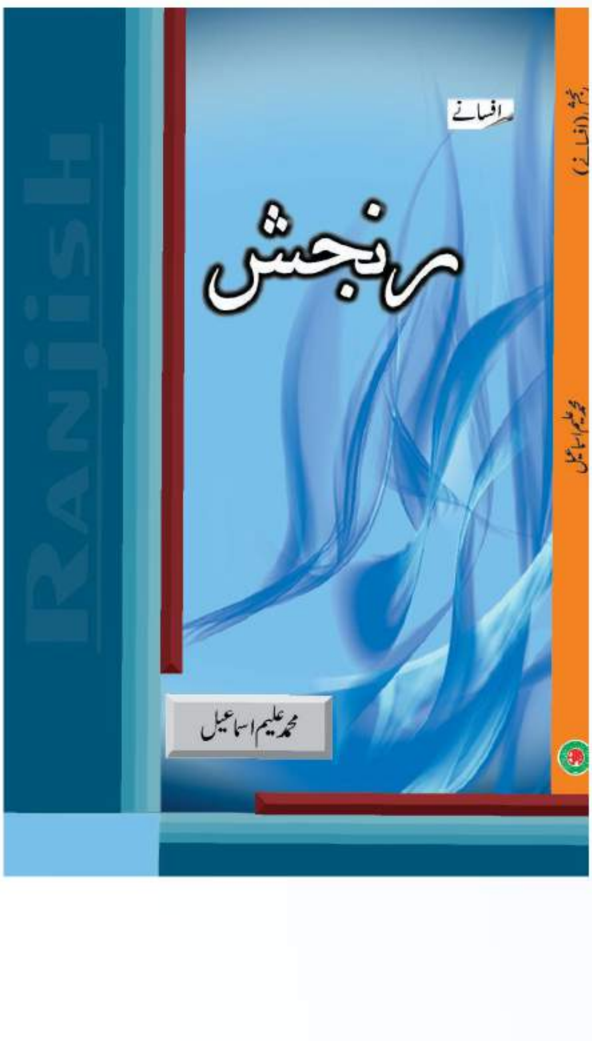

شاعرات کے منتخب اشعار

ہونٹوں پہ کبھی ان کے میرا نام ہی آئے
آئے تو سہی برسر الزام ہی آئے

لمحات مسرت ہیں تصور سے گریزاں
یاد آئے ہیں جب بھی غم و آلام ہی آئے

ادا جعفری

مجھے جنوں ہے نہیں نشۂ شراب میں ہوں
میں ایک جذبۂ بے نام اضطراب میں ہوں

کسی کا حسن تصور کسی کا ذوق نظر
خیال و خواب سہی عالم شباب میں ہوں

خورشید بانو شمع

ایک کے گھر کی خدمت کی اور ایک کی دل سے محبت کی
دونوں فرض نبھا کر اس نے ساری عمر عبادت کی

جامۂ الفت بنتے آئے رشتوں کے دھاگوں سے ہم
عمر کی قینچی کاٹ گئی سب ، کاہے کو اتنی محبت کی

زہرا نگاہ

تیری چاہت کے جبر پیہم میں
کب سے زنجیر ہوں رہائی دے

روح کے جنگلوں میں کس کی صدا
جب بھی سوچوں مجھے سنائی دے

پروین فنا سید

کبھی دھنک سی اتری تھی ان نگاہوں میں
وہ شوخ رنگ بھی دھیمے پڑے ہواؤں میں

میں تیز گام چلی جا رہی تھی اس کی سمت
کشش عجیب تھی اس دشت کی صداؤں میں

فہمیدہ ریاض

وہ چاند چھپ گیا تھا اچانک پس شجر
اے حسن سوگوار ترے ساتھ کون تھا

وہ آکے تیرے شہر سے جا بھی چکا مگر
چشم امید وار ترے ساتھ کون تھا

عرفانہ عزیز

یوں خیالوں میں ترے لہجے کی نرمی آئی
تو نہ بولے تو تری آنکھ کا جادو بولے

ہے خموشی میں بھی انداز تکلم اس کا
کبھی آنکھیں، کبھی چہرہ، کبھی بازو بولے

صدیقہ شبنم

خبر نہیں یہ اسیری ملی تو کیسے ملی
ہمارے ہاتھ تھے اور چوڑیوں کا گھیرا تھا

مچل رہی ہیں لہو میں یہ ناگنیں کیسی
یہاں ابھی ابھی شاید کوئی سپیرا تھا

رفیعہ شبنم عابدی

(اردو شاعرات اور نسائی شعور، ڈاکٹر فاطمہ حسن، انجمن ترقی اردو ہند، 2022)

ڈاکٹر فریدہ تبسم

زندگی دھوپ۔۔۔تم گھنا سایہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں لانگ ڈرائیو پر جارہی تھی۔ جہاں میں جارہی تھی وہاں کھلی شاہ راہ سڑک دونوں طرف گھنے درخت تھے جیسے جیسے ہماری گاڑی آگے بڑھتی جاتی سایہ دار درخت ایسے محسوس ہوتے جیسے دونوں طرف سے یہ ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہوں خوشگوار ماحول تھا خوبصورت موسم تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ کہیں کہیں بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ان چھتری نما درختوں کے نیچے سے ہماری گاڑی گزر رہی تھی۔ بالآخر میں نے اپنی پسندیدہ جگہ پر کار روکی۔ ایک سایہ دار درخت کے نیچے ستانے کے لیے بیٹھ گئی۔ یہ درخت میرا جانا پہچانا درخت تھا۔ اکثر و بیشتر میں اپنے والد کے ساتھ بچپن میں آیا کرتی۔ یہ درخت مجھے بہت پسند تھا میں اس درخت کے نیچے بیٹھ جاتی ہوں تو مجھے اس درخت کا وہ واقعہ بار بار یاد آنے لگتا ہے۔ یہ ایسا درخت ہے جس کی کہانی نہایت حسین بھی ہے اور عجیب وغریب بھی ہے۔ دراصل میں نے جب اس درخت کو پہلی بار دیکھا تو یہ درخت چند شاخوں پر مشتمل تھا۔ پوری طرح چھاؤں دینے کے قابل نہ تھا۔ اس کے پتے نہایت خوبصورت تھے اور پھول لال رنگ کے کھلے ہوئے تھے۔ یہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ لوگ اس کی خوبصورتی کو رک کر دیکھا کرتے۔ اسکے

اس کے پھول جب بھی زمین پر گرتے بچے اپنے پاس رکھنے کے لیے لڑا کرتے۔ یہ اپنے آپ میں ایک مثال تھا۔ چند سال یوں ہی گزر گئے قریب پانچ برس بعد میں پھر اس درخت کو دیکھنے کے لیے چلی آئی۔ اب اس درخت کی رونق بڑھ گئی تھی۔ شاخیں طویل اور گھنی ہو گئیں تھیں۔ دو یا تین لوگ آرام سے اس درخت کے نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ اس درخت پر

"دل نے چاہا کہ اس پر جا کر تھوڑی دیر آرام کرے۔ پرندہ ابھی اسی سوچ میں تھا کہ ہوائیں تیز چلنے لگیں موسم اچانک بدل گیا۔ بادل امڈ کر آئے اور بارش نے اپنا رنگ جمایا۔ پرندہ اپنے گھونسلے میں چلا گیا۔ لیکن اس کا پورادھیان اس نئے درخت میں تھا۔ وہ اپنے خیالوں کی دنیا میں کھو گیا کہ دنیا میں ہر چیز ارتقاء پذیر ہے۔ وہ ترقی کے مراحل طے کرتی جاتی ہے۔ جو جامد ہے رکی ہوئی ہے۔ دنیا اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھتی رہتی ہے یہ دنیا کا دستور ہے۔ کوئی بھی جاندار چیز اپنی جگہ قائم اور باقی نہیں رہے گی۔ باقی اور قائم رہنے والی صرف خدا کی ذات ہے۔"

ایک خوبصورت سے پرندہ نے اپنا گھونسلا بنایا تھا۔ وہ روزانہ اپنا دانہ چگ کر آتا اور شام کے وقت اپنے آشیانہ میں آرام کرتا یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ اب درخت بھی کافی گھنا ہو گیا تھا اور اس پرندہ کا گھونسلا چنوں کی آڑ میں چھپ گیا۔ کہیں کہیں سے نظر آتا تھا۔ کسی نے ایک دن اچانک اس کے بالمقابل ایک درخت لگایا اور وہ اسے روز پانی دیا کرتا۔ اس دوسرے درخت کی خوبی ہی تھی کہ یہ خوشنما بھی تھا اور حسین بھی تھا اور اس کے پھولوں میں مہک بھی تھی گلابی رنگ کے اس کے پھول ماحول کو مہکا دیتے اور سارا ماحول معطر ہو جاتا۔ پرندہ جب شام کو اپنے آشیانہ کی طرف لوٹ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ چند شاخوں پر مشتمل ایک نیا درخت کسی نے سایہ دار درخت کے بالمقابل لگایا ہے۔ پرندہ تھوڑی دیر کے لیے حیرت میں پڑ گیا۔ چونکہ اسے اپنے آپ میں یہ غرور تھا کہ وہ جس درخت پر رہتا ہے وہ سب سے زیادہ حسین سایہ دار ٹھنڈی ہوا دینے والا ہے۔ لیکن یہ کیا؟ اس نئے درخت پر نظر پڑتے ہی نظر میں ٹھہر گئیں۔ دل نے چاہا کہ اس پر جا کر تھوڑی دیر آرام کرے۔ پرندہ ابھی اسی سوچ میں تھا کہ ہوائیں تیز چلنے لگیں موسم اچانک بدل گیا۔ بادل امڈ کر آئے اور بارش نے اپنا رنگ جمایا۔ پرندہ اپنے گھونسلے میں چلا گیا۔ لیکن اس کا پورا دھیان اس نئے درخت میں تھا۔ وہ اپنے خیالوں کی دنیا میں کھو گیا کہ دنیا میں ہر چیز ارتقاء پذیر ہے۔ وہ ترقی کے مراحل طے کرتی جاتی ہے۔ جو جامد ہے رکی ہوئی ہے۔ دنیا اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھتی رہتی ہے یہ دنیا کا دستور ہے۔ کوئی بھی جاندار چیز اپنی جگہ قائم اور باقی نہیں رہے گی۔ باقی اور قائم رہنے والی صرف خدا کی ذات ہے۔ پرندہ ابھی خیالوں میں گم تھا کہ بارش تھم گئی اور موسم بہت خوشگوار اور حسین ہو گیا اور ہر طرف ہریالی، پتوں کے رنگ صاف اور پھول ہر طرف صاف وشفاف اس سے پاک حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔ اس پرندہ کا دل نئے درخت میں اٹکا ہوا تھا درخت اپنی طرف اسے کھینچتا ہی جاتا تھا۔ روز کی طرح وہ اپنے درخت کی ایک ایک ٹہنی پر بیٹھتا اور چہکنے لگتا۔ وہ اپنے دل کو قابو میں کرنے کی پوری کوشش کرتا لیکن ہار جاتا اور وہ سوچتا اس نئے درخت پر کاش! اپنا آشیانہ ہوتا!

ایک دن پھر موسم بدل گیا خوشگوار ہوائیں چلنے لگیں۔ پرندہ بے قابو ہو گیا۔ اور اس نئے درخت نے بالآخر پرندہ کا دل موہ لیا۔ پرندہ اب نئے درخت کی شاخوں پر جھولنے لگا کبھی اس شاخ پر تو کبھی اس شاخ پر اسے بہت خوشی مل رہی تھی۔ چونکہ اس درخت میں کچھ ایسی بات تھی جو اسے بار بار اپنی طرف متوجہ کرتی۔ آج پرندے کو سکون واطمینان تھا۔ اُس نئے درخت نے تو دل ودماغ کو معطر کر دیا تھا۔ اب اس پرندہ کا معمول بن گیا تھا کہ روز تھوڑی دیر ستانے کے لیے اس نئے درخت پر بیٹھ جاتا اور اپنے آپ کو پرسکون ماحول میں پاتا۔ جب اس کی یہ حرکت اس پرندہ کے گھر والوں کو معلوم ہوئی تو وہ بھڑک اٹھے۔ سب اس پرندے کے خلاف ہو گئے۔ جس نے تمھیں زندگی کی خوشیاں دیں رہنے کے لیے آشیانہ دیا۔ جس درخت نے تمھیں سہارا دیا۔ ہر موسم دھوپ ہو یا چھاؤں۔ بارش ہو کہ گرمی۔ تمہارا ساتھ دینے والا یہی درخت تو تھا تم کیسے اسے نظر انداز کر کے نئے درخت کی دوستی کو قبول کرتے ہو یہ تو ناانصافی ہے؟ ہم اس معاملہ میں تم سے سخت ناراض ہیں۔ پرندہ حالات کو قابو میں کرنا جانتا تھا۔ اس نے گھر والوں کو تسلی دی کہ میں تھوڑی دیر کے لیے اس کی شاخوں پر چلا جاتا ہوں اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنے آشیانہ کو بھول گیا ہوں۔

اس نئے درخت کی شہرت سارے گاؤں میں پھیل گئی تھی یہ گاؤں سے دور تھا۔ لوگ جب بھی یہاں سے گزرتے اس درخت کا ضرور ذکر کرتے بالآخر گاؤں والوں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ اس نئے درخت کو اکھاڑ کر اپنے گاؤں کے علاقہ میں لگایا جائے پھر ایک دن مقرر ہوا اور سبھی کی متفقہ رائے سے اس درخت کو وہاں سے اکھاڑ کر گاؤں لے جایا گیا اور گاؤں کے خوبصورت علاقہ میں اسے لگایا گیا۔ چند ہی دنوں میں گاؤں والوں نے خوب

دیکھ بھال کی اور درخت اپنی شاخیں پھیلانے لگا اور اپنے پھولوں سے گاؤں کے ماحول کو معطر کرنے لگا۔ اس درخت کی خاصیت تھی کہ وہ جہاں بھی رہتا اس کے ماحول کو معطر کر دیتا۔ گاؤں والے بہت خوش تھے۔ جب شام میں پرندہ اپنے آشیانہ کی طرف لوٹ رہا تھا تو حیران رہ گیا یہ کیا کہ نیا درخت غائب ہے۔ نہایت صدمہ ہوا اور وہ وہیں بیٹھ گیا اس میں اڑنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ مایوس اور افسردہ پرندہ جیسے تیسے اپنے گھونسلے کی طرف روانہ ہوا اور روزانہ وہ اس نئے درخت کی جگہ پر جا کر بیٹھ جاتا اور اپنی پرانی یادیں تازہ کرتا۔ یہ اس کا معمول ہو گیا تھا۔ پرندہ کی زندگی افسردگی میں بدل گئی تھی۔

اچانک ایک دن اس نئے درخت کی جگہ نئی کونئی نپل نظر آئی۔ شاید کچھ جڑیں اس زمین میں رہ گئیں تھیں۔ چند دنوں بعد یہ کونپل پودا میں تبدیل ہوئی اور پودا بڑھنے لگا۔ بارش کا موسم تھا پودے کو بڑھنے کے لیے پانی میسر تھا۔ پھر پرندہ اس کی نگرانی کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس درخت میں شاخیں پھیلنے لگیں دن پر دن گزرتے گئے۔ آج اس درخت پر نیا پھول آیا تھا۔ پرندہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

اچانک ایک دن اس نئے درخت کی جگہ نئی کونئی نپل نظر آئی۔ شاید کچھ جڑیں اس زمین میں رہ گئیں تھیں۔ چند دنوں بعد یہ کونپل پودا میں تبدیل ہوئی اور پودا بڑھنے لگا۔ بارش کا موسم تھا پودے کو بڑھنے کے لیے پانی میسر تھا۔ پھر پرندہ اس کی نگرانی کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس درخت میں شاخیں پھیلنے لگیں دن پر دن گزرتے گئے۔ آج اس درخت پر نیا پھول آیا تھا۔ پرندہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کئی سالوں بعد آج اسے وہی خوشبو وہی ماحول پھر سے نظر آنے لگا۔ آج اس پھول کی خوشبو اس کی نس نس میں سمائی ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ میں پھولے نہیں سما رہا تھا۔ پھر سے اس کی بہاریں لوٹ آئیں تھیں۔ یہ درخت آہستہ آہستہ بڑھ کر سایہ دار درخت میں تبدیل ہو گیا۔ اب اس کی شاخیں اتنی بڑی ہو گئیں تھیں کہ پرانے سایہ دار درخت سے ٹکرانے لگیں تھیں۔

ایک دن اچانک پرانے درخت نے دیکھا کہ نیا درخت اس قدر اونچا اور گھنا ہو گیا ہے کہ وہ میرے مقابل کھڑا ہے اس نے ہمت کر کے اس درخت سے بات کی۔ اے نئے درخت! تجھے تو ہم نے جگہ دی تیرا خیال رکھا تجھے بھی ہم نے اپنا جانا۔ تو کیوں میرے پرندے کو اپنی طرف کھینچتا ہے؟ میرا پرندہ میرے اندر رہتا بستا ہے لیکن اس کی روح تجھ میں بستی ہے وہ تیرا دیوانہ ہے تو نے ایسا کیوں کیا؟ نیا درخت پہلے تو گھبرایا پھر ہمت کر کے جواب دیا۔ اے میرے دوست میرے ساتھی! میں نے کچھ نہیں کیا میں تو اپنی فطرت اور عادت سے مجبور ہوں میں کسی کو غمزدہ یا دکھی نہیں دیکھ سکتا جب بھی تیرا پرندہ دانہ چگنے جاتا ہے تو تھک جاتا ہے زمانہ کی تیز دھوپ کو برداشت نہیں کر پاتا۔ اور جب وہ لوٹ رہا ہوتا ہے تو راستے میں تو پہلے میں ہی ہوتا ہوں۔ اور وہ میری شاخوں پر بیٹھ جاتا ہے۔ میں اسے تسلی دیتا ہوں زندگی جینے کی ہمت و حوصلہ دیتا ہوں اور میری ان باتوں سے وہ زندگی جینے لگتا ہے۔ اپنی ٹھنڈی ہواؤں سے اس کے ذہن و دل کو معطر کرتا ہوں تو وہ اپنے آپ کو پر سکون اور تسلی بخش محسوس کرتا ہے۔ اس کے بعد میں اسے یہ بھی نصیحت کرتا ہوں کہ جا تیرا آشیانہ تجھے آواز دے رہا ہے۔ تیرا درخت مجھے بلا رہا ہے تیرا اصل مقام وہیں ہے میں تو! میرا ٹھکانہ تیری زندگی میں تھوڑی دیر کا ہے۔ تو پرندہ کہتا ہے کہ اس تھوڑی دیر میں میں اپنی زندگی جی لیتا ہوں اور میرے اندر جینے کا سلیقہ آتا ہے۔ اس لیے میں تیرے قریب رہنا چاہتا ہوں۔ بھلے ہی سماج کے ڈر سے مجھے قریب آنے سے روکے اور مجھ سے بات نہ کرے۔ گفتار نہ سہی روز تیرا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔ تیرے سایہ سے گزرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس میرا آشیانہ تو ہے گھنا درخت سایہ تو دیتا ہے مگر سکون نہیں۔ میں اس سکون کی تلاش میں تیری شاخوں پر اپنا وقت گزارتا ہوں۔ تھوڑی دیر ہی سہی تیرا ساتھ چاہتا ہوں۔ چونکہ زندگی دھوپ ہے اور تو میرے لیے سایہ گھنا سایہ۔۔۔۔۔۔ میرا سکون اور۔۔۔۔۔ میری جینے کی وجہ۔ اچانک پرندے کی آنکھ کھلتی ہے۔ اور اس کے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں وہ اپنے آپ کو اس جگہ پاتا ہے جہاں چند دن قبل نیا درخت تھا۔ وہ اب بھی اس کی خوشبو کو محسوس کر رہا تھا اور وہ آنکھیں موندے بیٹھا ہے۔ تیز دھوپ کی وجہ سے اس کی تشنگی بڑھ گئی ہے۔ اور سایہ کی تلاش جاری ہے۔ میرا سایہ۔۔۔۔۔۔ سایہ۔۔۔۔؟

□□□

Dr.Fareeda Tabassum
Tabassum Villa,Khari Bowli
Mominpura
Gulbarga-585104 (K.S)

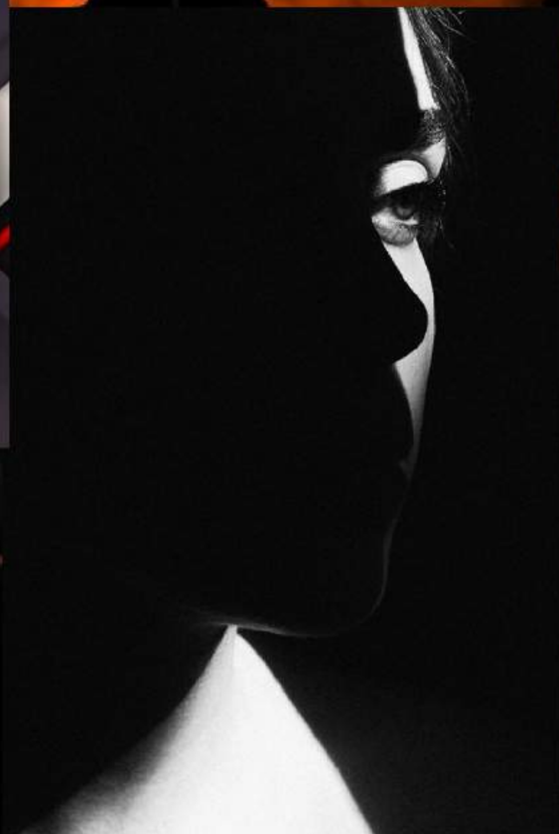

نازنین فردوس

پین کلر

وہ اس وقت اس بلڈنگ کی دوسری منزل پر بنے فلیٹ کے کچن میں کھڑی تھی۔ اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے اور اسے ناشتہ بنانا تھا لیکن اس کی نظریں بار بار کچن کی کھڑکی سے نیچے اس گھر پر پڑ جاتی تھیں جہاں صبح چار بجے سے ماتم کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہاں چالیس سالہ نیاز صاحب کا انتقال ہوا تھا اور ان کے گھر سے ان کی بیوی کی بین کرتی آوازیں آ رہی تھیں اور وہ ان آوازوں کو اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔ اسے ان کا دس سالہ بیٹا اور دو سال کی بیٹی کی کم سنی یاد آ رہی تھی۔ کیسے رہیں گے وہ معصوم بچے اپنے والد کی محبت کے بغیر۔

ان کی شفقت کو ابھی تو محسوس کرنا شروع کیا تھا۔ وہ ننھی دو سالہ تو ابھی باپ کا لمس بھی محسوس نا کر سکی تھی اور اس لمس سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گی تھی.

اس سب کو سوچتے اس کا دل بے ساختہ ان کے گھر جانے کے لیے لپکنے لگا کہ وہ جائے اور نیاز کی بیوی کے گلے لگے اور وہ ان بچوں کے سر پر ہاتھ رکھے محبت کا ہاتھ۔ وہ حساس تھی۔ کسی کے درد کو شدت سے محسوس کرنے کی عادت تھی۔

زیب۔ زیبا۔ ناشتہ تیار ہو تو ذرا جلدی نکال دو۔ آفس جانا ہے۔"

احمد کی آواز آ رہی تھی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا۔

مما۔ میرا یونیفارم نکالیں۔ جلدی پلیز۔" گڈو اسے پکار رہا تھا۔"

بہو۔ بہو۔ میری دوائیاں کہاں رکھ دی ہیں۔ مل نہیں رہیں۔"

اس کی ساس اپنے کمرے سے آواز دے رہی تھیں۔

اس نے جلدی سے چولہا سلگایا اور برتن رکھا۔ تیل ڈالا اور مصالحہ بھوننے لگی اب اس کے ہاتھ جلدی جلدی چل رہے تھے۔

سالن میں ڈالے ادرک لہسن کی خوشبو اس کے نتھنوں میں آنے لگی۔ اور چمچ چلانے کی آوازوں میں نیچے نیاز صاحب کے گھر سے آتی آوازیں دب گی تھیں۔ مصالحہ کی خوشبو میں اگر بتی کی خوشبو مدغم ہونے لگی۔

اس نے روٹی کی ڈش اٹھائی اور باہر کھانے کے برتن جمانے لگی۔

کمرے سے گڈو کا یونیفارم نکالا۔ اسے آواز دے کر وہ اپنی ساس کے کمرے میں آ ئی تھی۔

وہ کچھ بے زاری اپنی دواؤں کا ڈبہ پکڑے بیٹھی تھیں۔

"امی۔ لائیں آپ کی دوائیاں دے دوں۔"

"میرے گھٹنوں کا درد رات سے ستا رہا ہے۔ شاید کل گولی نہیں کھائی تھی۔ تم نے مجھے وہ دوا نہیں دی تھی۔ جس سے درد کم ہوتا ہے۔"

ہاں امی۔ وہ پین کلرز ختم ہو گئی ہیں میں احمد کو بولتی ہوں آفس سے

آتے ہوئے وہ لے آئیں گے۔' اس نے ساری دوائیاں چیک کی تھیں اس میں کہیں کوئی پین کلر نہیں تھی۔

"یاد سے منگوالینا۔ اس کے بغیر تو زندگی نہیں گزرتی۔ درد کی شدت سے دل چاہتا ہے کہ کہیں نکل جاؤں اور خود کو ختم کرلوں۔" اس کی ساس اب واپس لیٹتے کہہ رہی تھیں۔ وہ کئی سالوں سے اس عارضہ میں مبتلا تھیں۔۔

"جی۔ کبھی درد اتنا بڑھتا ہے کہ سمجھ نہیں آتا کہ ایسی کونسی پین کلر استعمال کریں جس سے درد کی شدت میں کمی ہو۔"

وہ ان پر ایک نظر ڈالتی باہر آئی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس کا شوہر ٹی وی پر کچھ لائیو خبریں دیکھتے ناشتہ کے لیے بیٹھا تھا۔ گڈو دودھ اور کارن فلیکس والا باؤل اپنے سامنے رکھے بیٹھا تھا۔

"میں نیاز صاحب کی تعزیت کے لیے چلی جاؤں۔" اس نے کھانے میں مصروف اپنے شوہر کو دیکھا تھا۔

"ہاں چلی جانا۔ مگر ابھی اتنی جلدی مت جانا۔ شام تک چلی جاؤ۔ ناشتہ کرلو سکون سے۔" وہ روٹی کا نوالہ توڑتے اسے بولا تھا۔

وہ چپ رہی۔

نیاز صاحب سے ان لوگوں کے اچھے مراسم تھے۔ وہ اور نیاز صاحب، دس سال سے پڑوسی تھے۔ اچھے برے میں ایک دوسرے کا ساتھ بھی تھا مگر اسے اس کے شوہر کی بے حسی کھلی تھی۔ ایسے وقت میں پڑوس کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ کسی کی موت پر صرف دو لفظ بولنا کافی نہیں ہوتا۔ ان کا احساس کرنا ضروری ہوتا ہے۔ میت کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانا یہ بھی پڑوسی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ وہ چپ چاپ اپنی بالکونی میں آ گئی تھی۔ جہاں سے نیاز صاحب کے گھر کا آنگن نظر آ رہا تھا۔ ان کی بیوی اب روتے روتے بے ہوش ہوگئی تھی اور بچے سہمے سہمے کونے میں بیٹھے تھے۔ اس کے دل کی سوگواری بڑھ گئی تھی۔

ابھی تین ماہ قبل ہی ان کے محلے میں رحیم صاحب کی بیٹی کی خودکشی کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ رحیم صاحب کی بیٹی نے زہر کھا لیا تھا۔ سارا محلّہ اس کو دیکھنے اُمڈ پڑا تھا۔ وہ بھی گئی تھی۔ تبسم سے وہ اکثر ملتی رہتی تھی۔ تبسم خوش اخلاق لڑکی تھی۔ عمر کے تیس سال اس کے اسی نومبر میں پورے ہوئے تھے، ۔ اور اس کی شادی کی آس کی ڈور اب ٹوٹنے پر آ گئی تھی۔ ابھی کچھ دن قبل ہی تبسم کو دیکھنے لڑکے والے آئے تھے اور دیکھ کر تبسم کی بڑی عمر، سانولا رنگ، اور اعلیٰ تعلیم پر ناک بھوں چڑھاتے چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد تبسم اس کے پاس آئی تھی۔ اس کے چہرے پر معنی خیز سی مسکراہٹ تھی۔ جس پر اس نے کہا تھا۔

"تبسم۔ لگتا ہے لڑکے والوں نے تمھیں پسند کرلیا۔"

تبسم دھیمے دھیمے ہنستے ہوئے اچانک کھلکھلانے لگی تھی۔

"آپی۔ انھوں نے مجھے تو پسند کر لیا۔ مگر میری غریبی اور میرا نوکری کرنا انھیں پسند نہیں آیا۔ اسی لیے میری عمر اور سانولا رنگ بتا کر مجھے ناپسند کا ٹھپہ لگا دیا اور چونکہ مردوں کے ساتھ کام کرتی ہوں تو بدکردار بھی تو ہوں۔ اس سے بری بات کیا ہوگی تو انھوں نے مجھے ناپسند کیا۔"

"تم ہنس رہی ہو تبسم۔" مجھے اس کے ہنسنے پر حیرانی ہوئی۔

"آپی۔ جس دن تبسم رونے پر آجائے تو زمین کے سارے سمندر اس کے نمکین آنسوؤں سے بھر جائیں۔ اور آسمان بھی میرے سنگ سنگ رونے لگ جائے۔ اسی لیے تبسم صرف ہنستی ہے۔ بابا نے صرف مسکراتا دیکھنے کے لیے یہ نام رکھا ہے۔ اور اگر تبسم کو کسی نے رلایا تو وہ سارے زمانے کو رلا دے گی۔

اس کی باتوں سے اسے خوف آیا تھا لیکن اس نے تبسم کو تسلی دی تھی۔ لیکن دو دن بعد جب تبسم نے خودکشی کی تو وہ بھاگی بھاگی اس کی اماں کے پاس جا پہنچی۔

"بھابھی۔ کیوں کیا تبسم نے ایسا۔ زہر کیوں کھا لیا۔"

"میری بیٹی عزت کی زندگی کے لیے زہر پینے پر مجبور ہوگئی۔ کیونکہ اب ہر جگہ اس پر الزام لگنے لگے تھے۔ وہ باہر جاتی ہے۔ آفس میں کام کرتی ہے۔ مردوں سے سابقہ رہتا ہے اور اور۔۔۔ چونکہ اس کی شادی نہیں ہوئی۔ تو ہر انسان کو حق ہو گیا تھا اس پر الزام لگانے کا۔ زہر پی کر میری بیٹی نے سب کا منہ بند کردیا۔ اب کیا کہیں گے لوگ۔"

اس کی ماں اب دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور وہ بس ایک ٹک تبسم کے مردہ وجود پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اس کا ہنستا چہرہ اب نیلا پڑ رہا تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی۔

"تبسم۔ یوں نا رلا کر جا آج۔ ہم سب شرمندہ ہیں'۔ سماج میں غربت کی چکی میں پستے لوگوں کی مجبوری کو ہم نہیں سمجھتے لیکن ایسے لوگوں پر انگلی اٹھانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان کے گھروں میں کبھی جھانک کر دیکھیں کیسے تبسم جیسی لڑکیاں اپنی عزت آبرو بچائے پیٹ کا دوزخ بھرنے جاتی ہیں اور انھیں بدکاری کے طعنے سہنے پڑتے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک ہنستا چہرہ رویوں کے زہر سے نیلا پڑتا ہے مگر انھیں دیکھتا کون ہے۔ ہم سب تو اندھے بہرے گونگے ہوگئے ہیں۔

ہمارے احساس پر تو ایسی بے حسی کی برف جمی ہے جو شاید ایک درد

مند دل کی منتظر ہے۔مگر۔۔۔دردمند کوئی نظر نہیں آتا۔

عزت کی خاطر آج حوا کی بیٹی زہر پینے پر مجبور ہے۔حوا کی بیٹی کبھی ایک دن ہی زہر پی کر مر جاتی ہے اور کچھ حوا کی بیٹیاں روز رویوں کا زہر پیتی ہیں اور روز مرتی ہیں اور ان کے مرنے پر کوئی نوحہ کرنے والا بھی نہیں ہوتا۔

وہ تبسم کو یک ٹک دیکھتی رہی۔یہاں تک کہ اس کا جسم پھولنے لگا سارا جسم نیلا پڑ گیا۔اور لوگ اس کی موت کی وجہ اور اس پر اظہار افسوس کرنے کے بجائے،اس کے بدانجام پر فتویٰ دینے لگے۔اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ تبسم نے جو کیا وہ تو حرام تھا مگر ایک انسان کو حرام تک لے جانے والے یہ لوگ اپنے اعمال کیوں نہیں دیکھتے۔ہر انسان دوسروں کے اعمال کو حلال حرام کی کسوٹی پر پرکھنے کے بجائے خود کو،اپنے اعمال کو حرام حلال کی کسوٹی پر پرکھ لے تو شاید کوئی انسان حرام تک نا جائے۔حرام موت پر فتویٰ لگتا ہے۔لیکن حلال زندگی گزارنے کی کوشش کرنے پر انگلیاں کیوں اٹھتی ہیں۔یہ کوئی نہیں سوچتا یا سوچنا نہیں چاہتا۔

وہ بھی سب کی طرح دو بول تعزیت کے کہہ کر واپس آ گئی تھی اسے واپس آنا تھا۔اپنی زندگی کی طرف۔دوسروں کی زندگی میں ہزار بھونچال ہوں اپنی زندگی کے طوفان کا ہمیں خود ہی سامنا کرنا ہوتا ہے۔

انسان کی زندگی کبھی درد سے خالی نہیں رہتی۔یہ درد ہی تو ہے جو ہر حساس دل کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔اسے ایک پل سکون سے جینے نہیں دیتا۔اس کی کسک ہمیشہ دل میں محسوس ہوتی ہے۔

ابھی کچھ دنوں کی بات تھی. ان کے نیچے والے پورشن میں شمع اور ارمان کی فیملی رہتی تھی۔شمع اور ارمان کے دو بچے تھے اور وہ اپنے ساس سسر کے ساتھ رہتی تھی۔

اس دن شمع نے دعوت دی تھی کہ اس کی بیٹی کی سالگرہ ہے اور سب کو آنا ہے اور اس نے ہامی بھر لی تھی۔

اس کا خیال تھا وہ ایک فراک تحفہ میں دے دے گی۔لیکن بچی کے فراک کا سائز اسے پتا نہیں تھا۔اس لیے وہ دوپہر میں ہی شمع سے فراک کا سائز لینے کے لیے نیچے آئی تھی۔

دو بجے کا وقت تھا۔اور اس بلڈنگ میں بھی خاموشی ہی پہرا دے رہی تھی۔وہ مسکراتے اندر جا ہی رہی تھی کہ۔۔۔

"بولیے ابا۔آپ خاموش کیوں ہیں۔میں نے کہا بھی تھا کہ ان گلاب جامنوں کو ہاتھ بھی نہیں لگانا۔مہمانوں کے لیے رکھے ہیں۔لیکن پھر بھی دو گلاب جامن کم کیسے ہوئے۔" شمع بگڑے تیور لیے اپنے سسر یعنی فرید صاحب سے باز پرس کر رہی تھی۔وہ جو اندر جا رہی تھی شمع کی آواز سن کر رک گئی۔اس کا اندر جانا اس کے حساب سے ٹھیک نہیں تھا۔

"بیٹی۔مجھے بھی نہیں پتا کہ گلاب جامن کم کیسے ہوئے۔یہیں تو رکھے تھے۔سب گن کر۔" اس کے سسر کمزور آواز میں بولے تھے۔

"آپ کو خیال رکھنا تھا۔کہیں آپ نے تو نہیں کھا لیے۔" شمع نے انھیں شکی نظروں سے دیکھا تھا۔

"کیسی بات کر رہی ہو بیٹی۔میں کیوں کھاؤں گا۔مجھے تو۔۔۔مجھے تو ذیابطیس ہے۔ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔میٹھا کھانا۔" وہ اب مضبوطی سے بولے۔

"پھر کون کھا سکتا ہے۔یہاں تو صبح سے کوئی نہیں آیا۔بچے بھی ابھی نہیں آئے اور آپ اور امی ہی تو تھے یہاں جب گلاب جامن ہوٹل سے آئے تھے۔" شمع اب جرح کر رہی تھی۔فرید صاحب اب خاموش ہو گئے تھے۔

"اب جانے دو بیٹی۔بحث کیوں کر رہی ہو دو گلاب جامنوں کے لیے۔کیا پتا ہوٹل والوں نے کم دیے ہوں۔اب کیا سب سے لڑنے لگو گی۔" فرید صاحب کی زوجہ شمع کی ساس بھی وہاں آ گئی تھیں اور اب بات کو سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"ایسے کیسے ہوٹل والے کم دیں گے جبکہ آرڈر پورے دو سو گلاب جامنوں کا تھا۔ضرور آپ دونوں میں سے ہی کسی نے کھایا ہے۔" شمع جانے کیوں مطمئن نہیں تھی۔ ان بزرگوں سے بحث کر کے اس کی انا کو سکون مل رہا تھا۔

"ہم دونوں میں سے کسی نے نہیں کھائے وہ گلاب جامن۔" فرید صاحب اب بات ختم کرنے کی سعی میں اندر کمرے کی جانب جا رہے تھے۔

"ٹھہریے۔ابا۔آج تو میں پتا کر کے رہوں گی کہ گلاب جامن کھائے تو کس نے کھائے۔" شمع ان دونوں کو گھورتی ہوئی بولی۔

اب تمھیں یقین نہیں آ رہا تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔

یقین آ جائے گا اگر آپ۔۔۔۔" شمع کچھ دیر رکی۔فرید صاحب بھی آگے جاتے جاتے رکے۔کیا کہنے جا رہی تھی وہ۔۔۔

قسم کھائیں کہ آپ نے نہیں کھائے وہ گلاب جامن۔" شمع کی آواز میں نہ جانے زہر کیسے آ گیا تھا۔اس نے اپنے منہ پر ہاتھ روک کر اپنی آواز روکنے کی کوشش کی۔

"قسم۔۔۔"

فرید صاحب اور ان کی زوجہ بھی جیسے سکتہ میں آ گئے تھے۔

قسم ۔۔دو گلاب جامنوں کے لیے تم مجھے قسم کھانے کی بات کر رہی ہو۔گلاب جامن کھانا اتنا بڑا گناہ تو نا تھا۔" فرید صاحب کی آواز میں درد دکھ اذیت سب گھل مل گئے تھے۔

ہاں۔تو قسم کھائیں کہ آپ نے گلاب جامن نہیں کھائے۔ میں دوبارہ پوچھوں گی نہیں۔کھا سکتے ہیں قسم " کبھی کچھ لہجے کتنے زہر آلود ہو جاتے ہیں کہ ان کے لہجے کا اثر آس پاس کے ماحول میں بھی زہر گھول دیتا ہے۔

فرید صاحب چپ چاپ کانپتے پیروں کے ساتھ کھڑے رہے۔ شمع انھیں مسلسل گھورتی رہی۔

" کھائیں نا قسم آپ۔چپ کیوں ہیں۔" کاش وہ چپ ہوتی۔

فرید صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ایک بوڑھے کی آنکھوں سے نکلتے آنسو گواہ تھے کہ وہ دو گلاب جامن کے گناہ گار تھے۔

" دیکھا۔اب قبول کیا۔قسم کی بات آئی تو سچ نکل گیا ورنہ اب تک انجان بنے بیٹھے تھے۔" شمع کے لہجہ میں استہزا آمیز حقارت تھی۔فرید صاحب اور ان کی زوجہ کھڑکی میں اسے کھڑے دیکھ چکے تھے اور اب نادم سے تھے۔

ان کے جھکے سر نے اسے شرمندہ کر دیا تھا۔وہ نظریں جھکائے اوپر آئی تھی۔

دل چاہ رہا تھا رو کر آسمان سر پر اٹھا لے۔

ایک ذیابطیس کا مریض اگر خواہش سے مجبور چھپ کر گلاب جامن کھا چکا تھا تو اسے یوں سر عام رسوا کرنا کہ وہ اپنے وجود کو ذلت کی آگ میں جلتا محسوس کرے۔صحیح تھا۔

فرید صاحب ریٹائر تو اب ہوئے تھے لیکن اب تک ان کی ہی تنخواہ سے گھر کا خرچہ چلتا تھا۔ان کا بیٹا بہت معمولی تنخواہ پر ملازم تھا جبکہ فرید صاحب تو گورنمنٹ ملازم تھے اور اب تک ایک معقول وظیفہ ہر ماہ ان کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوتا تھا۔

لیکن ان سب کے باوجود وہ ایک باعزت زندگی گزارنے کے لیے ترس رہے تھے۔مگر کیوں۔

انھوں نے اپنے اولاد کی تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔

اولاد پر سب کچھ نثار کر دیا تھا۔اپنے لیے کچھ بھی جمع نہیں کیا تھا۔

والدین کے لیے اولاد ہی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔

اور اس پر سب کچھ لٹا کر وہ اتنے خوش ہوتے ہیں کہ اپنے مستقبل کی فکر سے آزاد ہو جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ جس طرح بے لوث ہو کر ہم نے اپنی اولاد کا خیال رکھا۔بس اسی طرح اولاد بھی ان کا خیال رکھے گی۔ ان پر روپے پیسے لٹا کر خوش ہو گی۔

ان کی بیماری میں رات رات بھر جاگے گی

اور علاج پر لاکھوں لگانے سے پیچھے نہیں ہٹے گی۔

مگر ہوتا کیا ہے۔

اولاد کو والدین بوجھ لگنے لگتے ہیں۔

ان کی بیماری سے انھیں گھن آتی ہے۔

ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے سے انفیکشن کا ڈر ہو جاتا ہے۔

ان کے وجود کی بدبو سے وہ اپنی ناک پر کپڑا رکھتے ہیں۔

اور سمجھتے ہیں کہ وہ ایک حساس ذمہ دار شہری ہیں۔

اپنی اولاد کے نخرے سہتے ہیں والدین کو ایک آنکھ بھی نہیں دیکھتے۔

اور یہ بھول جاتے ہیں کہ آج وہ والدین کے ساتھ جو کر رہے ہیں کل وہی کچھ ان کی اولاد کرے گی۔مگر بھول جاتے ہیں اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

ہر کمزور پر طاقتور غالب آتا رہتا ہے۔

یہی دنیا کا اصول ہے۔

اسے رونا آ رہا ہے۔تبسم کی بے وقت موت پر

اسے رونا آ رہا ہے۔نیاز صاحب کے مرنے پر اور بے حس لوگوں پر۔

اسے رونا آ رہا ہے فرید صاحب جیسے بوڑھوں پر۔جو تمام عمر اپنی کمائی سے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں اور اپنے بڑھاپے میں دو گلاب جامن پر ذلیل کر دیےء جاتے ہیں۔

****

لیونگ روم سے ٹی وی پر کسی اسلامی شہر پر بمباری کی خبر چل رہی تھی اور وہاں بھی وہی تھا۔چیخیں آہ و بکا،بچوں کے رونے کی آوازیں،ماؤں کا سسکنا،زخمی مریضوں کی درد بھری چیخیں۔

بم سے تباہ ہوئی عمارتیں اور کسی کی زندگی بھر کی کمائی کا لٹ جانا۔

اسے ایسا لگا۔وہ ساری آوازیں اس کے کانوں میں ایک ساتھ آ رہی ہیں۔ نیاز صاحب کے گھر سے آتی آوازیں جسے سن کر اس کا دل رو رہا تھا اور ٹی وی پر چل رہی یہ خبریں۔۔ایک جیسی خبر۔ایک جیسا دکھ۔۔۔لیکن کسی کے درد کو لے کر جو بے حسی تھی وہ ہر دو کے لیے ایک ہی تھی۔۔

دواخانوں میں درد کش دواؤں کی قلت۔مریضوں کا بغیر انیستھیسیا

کے،بغیر کسی پین کلرز کے آپریشنز۔مریضوں کی درد سے تڑپتی آواز اس کے کانوں سے ٹکرانے لگی تھیں۔۔

ایسا کیوں ہورہا ہے۔

یہ درد بڑھتا ہوا کیوں محسوس ہورہا ہے۔

کہیں کوئی پین کلر کیوں نہیں ہے۔جو اس روح کی اذیت کو کم کر سکے۔

وہ کیوں بھول جاتی ہے کہ درد آشنا لوگ احساس کی بیماری میں مبتلا اپنے حساس دل کو لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔

اس درد کا علاج کہیں نہیں ملتا۔

مداوا کہیں نہیں ملتا۔

درد کی دوا کہیں نہیں ملتی۔

ٹی وی پر خبریں ویسے ہی چل رہی تھیں۔بمباری کا سلسلہ رکا نہیں تھا۔تباہ شدہ ملک ساری دنیا کی بے حسی کا گواہ۔آسمان پر کالے دھویں اور اس دھویں میں معصوم بچوں کی نعشوں کا منظر کتنا دردناک تھا۔جگہ جگہ زمین زخم خوردہ محسوس ہورہی تھی اور آسمان اس ظلم کا گواہ تھا جو اس سرزمین پر پچھلے چالیس سالوں سے ظلم و بربریت کا مظاہرہ کیا جارہا تھا وہ ناقابل گرفت تھا۔

دن جنازوں میں نکل رہا تھا اور رات آہ و بکا میں۔زخم چیخ رہے تھے اور دل پھٹ رہے تھے ایسے مناظر دیکھ کر تو ایک بے حس انسان کے احساس بھی جاگ جاۓ مگر انسانیت پر ایسی بے حسی طاری ہوئی ہے کہ ہر ظلم پر ایک خاموشی ہے صرف خاموشی۔

کہیں کوئی آواز نہیں۔یوں جیسے سب گونگے ہو گئے ہوں اور بہرے بھی۔اگر سن سکتے تو ان بچوں کی درد بھری چیخیں سنتے جنکے جسم دھماکوں سے کٹ پھٹ گئے تھے اور معصوم بچے تھر تھر کانپ رہے تھے۔موت کا ڈر ان کے سر پر تھا اور زمین ان کے معصوم بدنوں کو نگلنے کے لیے بیتاب بیٹھی تھی۔

اگر بہرے نا ہوتے تو ان بیوہ عورتوں کی پکار سنتے جو رات کی ہولناک سناٹوں کو چیرتی ان کے حلق سے نکل رہی تھی۔

ان کے سر کے سائبان بم دھماکہ کی نذر ہو گئے تھے اور وہ ننگے سر آسمان کے تلے بیٹھی تھیں۔ان عورتوں کی چیخیں کسی نے نہیں سنیں۔

اگر بہرے نا ہوتے تو ان ماؤں کے گلے سے نکلے نالے سنتے جو جوان بیٹوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے شہید ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ان کی جوانی کو ظلم کھا گیا تھا۔ان کی اولاد کا دکھ اپنے سینوں میں دبائے وہ زندگی کی جانب شکوہ کناں تھیں کہ آج ظلم و بربریت نے شیطان کو بھی پیچھے کر دیا تھا۔

"احمد۔امی کے لیے پین کلرز لے آنا۔ختم ہو گئے ہیں" وہ اب احمد کے سامنے تھی۔

"ٹھیک ہے اور کچھ۔"وہ اب اپنا بیگ اٹھا رہا تھا۔

"ہاں۔ایسے پین کلز میرے لیے بھی لے آنا جس سے میں وہ درد نا محسوس کروں جو یہ سب ظلم دیکھ کر مجھے ہو رہا ہے اور ہر حساس دل کو ہوتا ہے۔

پین کلرز جسمانی درد کم کرتا ہے لیکن یہ جو روح کے درد سے بلبلا رہی ہے اس درد کی دوا کسی کے پاس نہیں۔

کوئی ایسا پین کلر بھی لادو جو اس روح کے درد کا مداوا کرے۔

یا ہم سب شاید پین کلرز کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ ہمیں درد کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ہم سب شاید احساس سے عاری قوم ہو گئے ہیں۔

دنیاوی لذتیں ہماری روح کو بے حس بنا رہی ہیں۔

جسم کا کوئی ایک بھی عضو تکلیف میں ہو تو آنکھ سے آنسو نکلتے ہیں۔آنکھ اس درد میں برابر کی شریک ہوتی ہے۔

آج امت مسلمہ پر ایسے ظلم ہو رہے ہیں کہ غیر بھی دیکھ کر اپنے آنسو روک نا پائیں مگر۔۔۔امت مسلمہ کا ایک بے حس طبقہ ایسا بھی ہے جو ہر احساس سے عاری ہو چکا ہے۔

جس نے اپنے اوپر بے حسی طاری کر لی ہو اسے کسی پین کلرز کی ضرورت نہیں ہوتی۔

روح کا زخمی پرندہ درد سے پھڑ پھڑا رہا ہو اور احساس کے تار جھنجھوڑ رہا ہو۔تب اس کی دوا کا خیال آتا ہے۔

اس درد کا مداوا کرے کوئی۔

ایسی پین کلر بنا دے کوئی جس سے انسانیت پر ظلم ہوتا دیکھ کر بھی درد محسوس نا ہو سکے۔

روح کی تکلیف کم کرنے کی بھی دوا بنا دے کوئی۔

اس کا دل نوحہ کناں تھا۔جسے احمد کبھی سن نہیں سکتا تھا۔

ختم شد

□□□

Naazneen Firdose

8-15-70/3/1 Mohammadia Colony,

Vattepally, Falaknuma,

Hyderabad-500053

Mob : +91 9866060259

کہانیاں

صاحبہ فردوس

انتظار اب اور نہیں

سنا تھا محبت میں عورت کو صبر اور انتظار کی گرہیں اپنے پلو سے باندھ کر رکھنا ہوتی ہیں، مگر میری محبت کا حساب کتاب کچھ الگ تھا۔ محبت نے مجھے سرتاپا سراپا انتظار بنا رکھا تھا اور میں بھی ماتھے پر ایک بھی شکن لائے بغیر انتظار کر رہا تھا۔ میری اس بے وقوفی پر دماغ نے مجھے پاگل قرار دیا تھا اور دل تھا کہ اُس ہی ڈگر پر جانا چاہتا تھا۔ مگر محبت میں مفروضات اور دلائل کہاں کام آتے ہیں وہ تو وہی کرتی ہے جو اُسے دل کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

میں اور مہر پچھلے آٹھ سال سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ہماری محبت کے رنگ بھی بڑے پکے تھے سات سال پہلے ہم دونوں کی ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ اور وہیں ہمارے درمیان محبت اپنا پتہ چھوڑ گئی تھی۔

میں جو ہر چیز میں جلد باز تھا مگر میں نے اپنی محبت کا اظہار کرنے میں نے دو سال لگا دیے تھے۔ یونیورسٹی بند ہونے والی تھی اور میرا آخری سمسٹر چل رہا تھا۔ میرے دوست جو میرے دلی حال سے بخوبی واقف تھے اُنھوں نے مجھے کئی بار مشورہ دیا کہ جا کر مہر سے اپنی محبت کا اظہار کر دو مگر میں ڈرتا تھا کہ کہیں وہ مجھے انکار نہ کر دے۔

اُس روز موسم کافی خوبصورت اور سرد تھا۔ سورج بادلوں کے جھرمٹ میں گم اپنا پتہ بھول چکا تھا۔ چاروں طرف چھائی دھند ہر چیز کو دھندلا گئی تھی۔ دھند میں لپٹی سرد ہوائیں ہڈیاں چیر کر آر پار ہو رہی تھیں۔ لوگ ٹھنڈ سے ٹھٹھراتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں دُبکے پڑے تھے اور کچھ میری طرح نکمے ناکام عاشق اپنے محبوب کا دیدار کرنے کے لیے دھند میں لپٹے سرد دن کو بھی بخشنے کے لیے تیار نہیں تھے اور کچھ پڑھائی کے دلدادہ اسٹوڈنٹس تھے۔ سرد موسم کے باعث یونیورسٹی میں ہر روز کی طرح دھوم نہیں تھی بلکہ کافی حد تک سنسان تھی۔ وہ اُس دن پھر یونیورسٹی کے گارڈن میں بیٹھی تھی جہاں سے میری محبت کا آغاز ہوا تھا۔

اُس نے گلابی لان کا ڈریس پہن رکھا تھا اور سلکی سیدھے بالوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ بال ہوا کے دوش پر ادھر اُدھر بکھر رہے تھے اور وہ کتاب کھولے اپنے آپ میں مگن تھی۔ میں اپنے دوستوں کے غیرت دلانے پر اُس کے سامنے چلا آیا تھا اور گلا کھنکھار کر اُس سے مخاطب ہوا تھا۔

''کیسی ہو مہر؟'' ہم دونوں کی اچھی طرح بات چیت تھی اس لیے وہ بھی مسکرا کر مجھ سے کہنے لگی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں عدیل آپ کی اسٹڈی کیسی جا رہی ہے؟'' اُس کے ایسے سوال پر میں بری طرح تپا تھا پھر مسکرا کر اپنی اسٹڈی کے بارے میں بتانے لگا تھا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔

''مہر مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

''جی کہیں میں سن رہی ہوں۔'' وہ کتابیں ایک طرف رکھتی ہوئی مجھے سنجیدہ دیکھ کر خود بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں مہر۔ اب سے نہیں پچھلے دو سال سے

اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''میری بات ختم ہو چکی تھی اور وہ مجھے خاموشی سے دیکھے جا رہی تھی۔ ہمارے بیچ خاموشی طویل ہوتی گئی تو میں گھبرا گیا کہ میں نے کہیں جلد بازی تو نہیں کر دی تبھی وہ خاموشی توڑتے ہوئے مجھ سے کہنے لگی۔

''میں اس بارے میں سوچوں گی۔''اتنا کہہ کر وہ میرے ہاتھ میں اُمید کی ڈوریں تھما گئی تھی اور میں اس ہی بات پر خوش ہو چکا تھا۔

شاید میرے جذبات میں اتنی صداقت تھی کہ وہ بھی میری محبت پر یقین کر گئی تھی۔ محبت کے اس سفر میں ہم دونوں ہمراہی بنے تین سال کا طویل سفر طے کر گئے تھے۔ شاید میری قسمت اچھی تھی اس لیے پڑھائی ختم ہوتے ہی مجھے اچھی فرم میں جاب مل گئی تھی۔

جاب لگنے پر امی اور دونوں بہنیں بہت خوش تھیں اب وہ میری شادی کروانا چاہ رہی تھیں۔ میں نے بھی اُن کے اگلے قدم اُٹھانے سے پہلے اُنھیں اپنی محبت کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا جس پر وہ بغیر اعتراض کیے مان گئی تھیں۔ اچھی طرح سے سیٹل ہونے کے بعد میں نے مہر کو اپنی شادی کا عندیہ دیا تو وہ خوش ہو گئی پھر اچانک اُس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ اُداسی سے کہنے لگی۔

''عدیل! میں جانتی ہوں مجھ سا کوئی خوش نصیب نہیں ہے، مگر تمھیں کچھ دن انتظار کرنا ہو گا۔ تم جانتے ہو ناں ابا کے انتقال کے بعد گھر کی ساری ذمے داریاں مجھ پر آ چکی ہیں۔''مہر سب سے بڑی تھی اور اس سے چھوٹی تین بہنیں تھیں۔ اس کے ابا کے انتقال کو دو سال ہو چکے تھے۔ مہر کا کوئی بڑا بھائی بھی نہیں تھا جو آگے بڑھ کر ساری ذمے داریاں اپنے کندھوں پر لے لیتا۔ میں اُس کی مجبوریوں کو جانتا تھا سو انتظار کرنے لگا۔

انتظار تھکا دیتا ہے اور محبت کو پا لینے کا انتظار تو بہت جلدی صبر کا باندھ توڑ دیتا ہے۔ مگر میں اُس کا انتظار کرتا رہا۔ انتظار کی گھڑیاں لمبی ہوتی گئیں۔ دو سال گزر گئے میں پھر اُس کے سامنے سوالی بنا کھڑا ہو گیا مگر وہ مجھے مایوسی سے کہنے لگی۔

''عدیل ابھی تو صرف ثانیہ کی شادی ہوئی ہے۔ عنایہ کی شادی اور انعم کی پڑھائی باقی ہے۔ پلیز تم تھوڑا اور انتظار کر لو۔''اور جب بھی وہ بیچارگی سے اپنی مجبوریاں مجھ سے بیان کرتی تو مجھے اُس سے مزید محبت ہونے لگتی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی خاموش رہ جاتا۔

سال تیزی سے بیتتے جا رہے تھے۔ وہ اپنی ذمے داریاں نبھاہ رہی اور میں انتظار کرتا رہا۔ خاندان والے دوست احباب میرا مذاق بنانے لگے تھے اور میں اتنے سال احمق بننے پر خود کو کوستا رہا اس بار میں فیصلہ کر چکا تھا اب اور انتظار کی سولی پر نہیں چڑھنا ہے۔

دل دماغ سے بغاوت کر رہا تھا اور میں نے دل کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا شروع کر کے لوگوں کی باتوں پر دھیان دینے لگا۔ اس لیے جذبات میں آ کر امی سے کہہ دیا کہ وہ جسے چاہیں اپنی بہو بنا لیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

اُس روز بھی وہ میرے کہنے پر دوڑی چلی آئی تھی۔ میں اُس کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔ میں جانتا تھا میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ مجھے ہر بار کی طرح اپنی مجبوریوں کی داستان سنائے گی اور میں بے وقوف بن بھی جاؤں گا۔ مگر اس بار میری توقع سے پرے اُس نے مجھ سے کہا تھا۔

''سنو! اب انتظار کی جان لیوا گھڑیاں ختم ہوئیں۔ تم اب میرے گھر آ سکتے ہو۔''اس کی بات سن کر دل میں کچھ چھنا کے سے ٹوٹا تھا۔ محبت کے غم میں سسکتا ہوا ایک آنسو دل کی زمین پر گر کر اُسے نم کر گیا تھا۔ میرے دل میں ایک گرم سی آنچ اُٹھی تب میں نے اُس سے ذرا سختی سے کہا تھا۔

''اب بہت دیر ہو چکی ہے مہر! اس جمعہ کو میرا نکاح ہے۔ میں نے یہی کہنے کے لیے تمھیں یہاں بلایا تھا۔''میری بات سُن کر وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں اتری بے یقینی میرے سلگتے مچلتے دل کو ایک پل کے لیے قرار بخش گئی تھی۔ میرے اندر مچلتے ہوئے برے انسان نے مجھے شاباشی دی۔ مگر محبت نے ترحم بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور افسوس سے سر ہلاتی رہی۔

اُسے انکار کر کے میں گھر آ گیا مگر دل کسی طور پر خود کو صحیح ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے اپنے دل کو ہزار دلائل دے کر سمجھایا اور خود کو اس زبردستی کے نکاح کے لیے قائل کیا۔ مایوں اور مہندی کے بعد وہ دن بھی آ گیا جس کا میری ماں اور بہنوں کو میرے پیدا ہونے کے بعد سے ہی ارمان تھا۔

آپا کہہ رہی تھیں کہ میں سفید کلف لگے کرتے میں اچھا لگ رہا ہوں۔ امی میری بلائیں لیتے نہیں تھک رہی تھیں اور چھوٹی مجھے چھیڑ رہی تھی۔ مگر میں نے چپی سادھتے ہوئے مجنوں کے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ میرے دوست مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے میری ناکام محبت کو بھلانے کی کوشش کر رہے تھے مگر میرا بجھا ہوا دل کسی چیز پر راضی نہیں ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

نکاح اور رُخصتی کی صبر آزما گھڑیوں کے بعد میں اپنے پھولوں سے آراستہ کمرے میں آیا تو سُرخ عروسی جوڑے میں وہ میرا انتظار کر رہی

تھی۔اُسے دور سے دیکھ کر ہی میرا دل ایک سو بیس کی اسپیڈ میں دھڑکا تھا۔میں نے خود کو بمشکل سنبھالا اور بیڈ پر آ بیٹھا تھا۔میرے بیٹھنے پر میری دلہن سنبھل کر بیٹھ گئی تب میں نے ہولے سے اُس کا گھونگھٹ اُٹھایا۔اُس کا جھکا ہوا شرمایا ہوا سا چہرہ میری نظروں میں ٹھہر گیا میرے لبوں پر بھی دلفریب مسکراہٹ ٹھکانہ کر گئی۔میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا جس پر وہ ہولے سے بولی۔

''عدیل!ایک منٹ۔''اُس کے اتنا کہنے پر میرے دل میں جلتے نئے اور انوکھے محبت کے دیپ ٹمٹمانے لگے تھے تب میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام کر لبوں سے لگایا اور کہا۔

''انتظار اب اور نہیں۔''میری بات پر اُس کی پلکوں کی چلمن گر چکی تھیں اور میرے لبوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ اُبھر گئی تھی۔

''اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بہت اچھی تھی وہ اپنے سے جڑے رشتوں کا حق ادا کرنا اور ان سے محبت کرنا جانتی تھی۔اس نے اپنی دونوں بہنوں کی شادی کروائی تھی۔ایک بہن کو اعلیٰ تعلیم دلوا رہی تھی اور اپنی بیمار ماں کی خدمت کر رہی تھی۔وہ سب کے لیے خوشیاں خرید رہی تھی پھر میں کیسے اُسے بیچ منجھدار میں چھوڑ دیتا۔اگر یوں ہی چھوڑ دیتا تو حالات سے سمجھوتہ کر کے ہارا ہوا انسان کہلاتا۔سب کو خوشیاں دینے والی ہستی کے لیے قدرت نے مجھے چنا تھا۔مجھے اُس کی زندگی میں بہار کا وہ جھوکا بن کر آنا تھا جو اس کے لیے خوشیاں اپنے دامن میں سمیٹ کر لے آتا۔میں نے اُس کے جھکے ہوئے کندھوں کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر لے لیا تھا۔''

آپ سب سوچ رہے ہوں گے کہ یہ مجھے کیا ہوا تھا۔میں تو مجنوں بنا پھر رہا تھا پھر کیوں اپنی شادی پر اتنا خوش تھا۔تو جناب مجھے اپنے خوابوں کی ملکہ مل چکی تھی۔ہاں مجھے میری مہر مل چکی تھی۔یہ بھی دلچسپ کہانی تھی کہ وہ کیسے میری زندگی میں آئی تھی۔

میں جو اُداسی کا مجسمہ بنا پورے گھر میں گھوم رہا تھا۔میری امی اور بہنیں میری ایسی شکل دیکھ اندر ہی اندر ہول رہی تھیں۔بلآخر امی سے رہا نہیں گیا تو وہ پوچھ بیٹھیں۔

''عدیل! کیا تم یہ شادی کرنا چاہتے بھی ہو یا نہیں؟''میں تو شاید ان کے سوال کا منتظر تھا تبھی میں نے اپنے دل کا درد بیان کر دیا تھا۔

''امی! کیا آٹھ سال کی محبت ایک ہفتے میں بھولائے جاسکتی ہے؟''پھر کیا تھا میرا اتنا ہی کہنا امی کو فیصلے پر پہنچا گیا تھا۔

امی نے ملیحہ جو میری ہونے والی دلہن تھی اس کے گھر والوں سے معذرت کر لی تھی اور مہر کے گھر دھرنا ڈال دیا۔مہر جو میری طرح اپنی ادھوری محبت کا غم غلط کر رہی تھی۔وہ امی کے منانے اور میری جذباتی بلیک میل پر مان گئی تھی۔

اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بہت اچھی تھی وہ اپنے سے جڑے رشتوں کا حق ادا کرنا اور ان سے محبت کرنا جانتی تھی۔اس نے اپنی دونوں بہنوں کی شادی کروائی تھی۔ایک بہن کو اعلیٰ تعلیم دلوا رہی تھی اور اپنی بیمار ماں کی خدمت کر رہی تھی۔وہ سب کے لیے خوشیاں خرید رہی تھی پھر میں کیسے اُسے بیچ منجھدار میں چھوڑ دیتا۔اگر یوں ہی چھوڑ دیتا تو حالات سے سمجھوتہ کر کے ہارا ہوا انسان کہلاتا۔سب کو خوشیاں دینے والی ہستی کے لیے قدرت نے مجھے چنا تھا۔مجھے اُس کی زندگی میں بہار کا وہ جھوکا بن کر آنا تھا جو اس کے لیے خوشیاں اپنے دامن میں سمیٹ کر لے آتا۔میں نے اُس کے جھکے ہوئے کندھوں کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر لے لیا تھا۔

وہ کہتے ہیں ناں محبت میں کچھ تیرا اور میرا نہیں ہوتا ہمارا ہوتا ہے سو ہم دونوں نے ایک دوسرے کی ذمے داریاں اُٹھا کر اُسے 'اپنی' بنا لیا تھے۔

ختم شدہ

□□□

Saheba Firdous
D/o. Mohammad Ismail
Village:Anjangaon Surji
Shaniwara Peth,
Near Alam Chowk
Distt . Amravati - 444705 (M.S)

نازیہ افروز

غزل

جب کہہ چکی حالِ دل، تو جانا
دیوار سے ہم کلام ہوں میں

اڑنے لگے آرزو کے پنچھی
جس روز سے زیرِدام ہوں میں

اب کون کرے مجھے مکمل
بے رنگ ہوں، نا تمام ہوں میں

مجھ کو نہ سزائے وصل دیجے
سیماب صفت، نظام ہوں میں

مشغول ہے دل مری نفی میں
جیسے کہ خیالِ خام ہوں میں

Nazia Afroz

At: Ahmad Ganj, P.O. Bakhadda

Via- S.Kamal

Distt.Begusarai-851217 (Bihar)

کوثر پروین

غزل

جنون و وحشت و ہوش و حواس کچھ بھی نہیں
ہماری روح کے تن پر لباس کچھ بھی نہیں

عجب سماں ہے کہ امید و یاس کچھ بھی نہیں
کہ تو ہی تو ہے مرے آس پاس کچھ بھی نہیں

چلے جو رختِ سفر باندھنے تو ہوش آیا
سفر طویل ہے لیکن اساس کچھ بھی نہیں

کسی کے عشق نے کیا بنا دیا مجھ کو
مرے وجود میں خوف و ہراس کچھ بھی نہیں

کسی کی پیاس نے پانی سے یہ کہا زم زم
کسی کی پیاس کے آگے یہ پیاس کچھ بھی نہی

حضور آپ کو کیوں اتفاق ہے اس سے
زمانے والوں کو کوثر سے آس کچھ بھی نہیں

Kausar Parveen

2B, Kimber Street

Kolkata-700017 (W.B)

نہاں رباب

نظم

پانی

یہ پانی
زندگانی کی نشانی ہے
اسی سے باغبانی ہے
اسی سے گلفشانی ہے
اسی سے سارے رنگوں پر جوانی ہے
اسی سے نسترن ہے
رات رانی ہے
اسی سے ارغوانی ہے
اسی سے زعفرانی ہے
اسی سے آسمانی ہے
اسی سے گلستاں میں رت سہانی ہے
اسی سے کھیت میں رونق
اسی سے فصل دھانی ہے
نہ ہو پانی
تو اڑ جا چنر دھانی
نہ گل مہکے
نہ بلبل شاخ پر چہکے
نہ جائے دل سے ویرانی

یہ پانی ہے کہ
فصلوں پر جوانی ہے
یہ پانی ہے کہ دریا میں روانی ہے
یہ پانی ہے
کہ دھرتی میں نمی ہے
زندگانی ہے
یہ پانی ہے کہ
ہر دل میں خوشی ہے شادمانی ہے
یہ پانی ہے کہ لب پہ لن ترانی ہے
مگر پانی ہماری زندگی سے جانے والا ہے
خزاں دل میں ہمارے لانے والا ہے
کہ اس کی قدردانی چھوڑ دی ہم نے
سنورو کو
زمیں پہ زندگی پانی کے دم سے ہے
سنورو کو
کہ دھرتی کی نمی پانی کے دم سے ہے
سنورو کو
کہ اپنی ہر خوشی پانی کے دم سے ہے۔

Neha Rubab
275/26F/404
Tulsipur
Prayagraj -211003 (U.P)

بال اور ناخن کے امراض

حکیم محمد اکبر

بال کے امراض

داء الثعلب۔ داء الحیّہ۔ بالچر

داء الثعلب۔ وہ مرض ہے جس میں صرف بال گرتے ہیں اور داء الحیّہ وہ ہے جس میں بال اور جلد دونوں گرتے ہیں۔ دونوں مرضوں میں جلد میں فساد ضروری ہے۔

علاج:۔ جس خلط کے غلبہ کے آثار پائے جائیں، اس کا تنقیہ کریں۔

انتشار و تساقط شعر۔ بالوں کا گرنا

اس مرض میں جلد میں کسی قسم کا فساد ظاہر ہوئے بغیر بال گرتے ہیں۔

علاج:۔ سبب کے موافق کریں۔

جبکہ سر کے بال گریں اور سر کی جلد بہت نرم ہو جائے تو اس کو ''علتِ نعامہ'' کہتے ہیں۔ نعامہ شتر مرغ کا نام ہے۔ یہ مرض شتر مرغ کو زیادہ ہوتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ سر کو جلد جلد مونڈیں اور سر پر عرصہ تک روغن آس اور روغن آملہ لگاتے رہیں۔

صلع۔ چندلا

اس مرض میں صرف سر کے درمیانی اور اگلے حصّے کے بال گر جاتے ہیں۔ (یہ عام طور پر بوڑھوں کو ہوتا ہے۔ اور گاہے قبل از وقت بطور مرض کے بھی ہو جاتا ہے۔ مترجم)۔

علاج:۔ وہی ہے جو کہ انتشار شعر کا بیان ہوا ہے۔لیکن اگر یہ مرض بڑھاپے میں ہوتو لا علاج ہے۔

تشقق شعر۔ بالوں کا چر جانا

علاج:۔ روغن بنفشہ۔روغن کدو وغیرہ لگا کر تری پہنچائیں۔

نموست۔ سر کی چکنائی

اس مرض میں سر چکنار رہتا ہے۔(گویا اس میں بگڑا ہوا تیل لگایا گیا ہے)۔

علاج:۔ اطریفلات کھلا کر تنقیہ کریں۔

شیب۔ بالوں کا سفید ہونا۔

اس سے مراد بالوں کا وقت سے پہلے سفید ہو جانا ہے۔ بالوں کے سفید ہونے کا اصلی وقت کہولت (ادھیڑ عمر) ہے۔

علاج:۔ روزانہ صبح کے وقت ایک عدد مربائے ہلیلہ کھلائیں اور ہر مہینے میں ایک ہفتہ اطریفل صغیر استعمال کریں۔ دو ماہ کے بعد بلغم کا مسہل دیں۔ترشیوں کے کھانے اور فصد اور جماع سے پرہیز رکھیں۔

بالوں کی خوبصورتی کی تدابیر

بالوں کی حفاظت کے لیے روغن لادن اور روغن مورد ملیں۔ بالوں کے لمبا کرنے کے لیے سر کو آملہ کے پانی سے دھوئیں۔اور برگ آس۔گل سرخ کو باریک کوٹ چھان کر آملہ کے پانی میں گوندھ کر سر میں لگائیں۔ بالوں کے اگانے کے لیے خاکستر قیصوم، سمندر جھاگ کو روغن زیت کہنہ میں گوندھ کر ملنا مفید ہے۔اور جو کچھ داء الثعلب اور داء الحیّہ میں بیان ہوا اس کا استعمال نافع ہے۔ بال مونڈنے کے لیے چونہ اور ہڑتال مشہور ہیں۔ بالوں کی پیدائش بند کرنے کے لیے اجوائن خراسانی۔ افیون اور شوکران سرکہ میں ملا کر لگائیں۔ نیز اس غرض کے لیے مازو۔ کچھوے کا خون اور چیونٹیوں کے انڈے لگانا بھی مفید ہے۔ بالوں کو گھونگھریالے بنانے کے لیے برگ بیر۔ مازو اور میتھی کو پانی میں بھگو کر اس پانی سے بالوں کو دھوئیں۔ بالوں کو باریک کرنے کے لیے ہلدی جلا کر چونہ میں ملائیں۔ اور اس کا غلولہ بنا کر بالوں پر پھرائیں۔دن میں چند مرتبہ کریں۔اور غلولہ کو ایک مقام پر نہ لگائیں تا کہ بال نہ منڈ جائیں۔ بالوں کو سیدھا کرنے کے لیے تا کہ بال نہ الجھیں تیل اور پانی ملا کر نیم گرم لگائیں۔ بالوں کو سیاہ کرنے کے لیے بالوں کو گرم پانی سے دھو کر مردار سنگ۔ چونہ بجھا ہوا اور ملتانی مٹّی تینوں ہم وزن لے کر پانی میں پیس کر سر پر لگائیں۔اور ارنڈ کے پتے باندھیں۔ایک پہر کے بعد کھولیں اور گرم پانی سے دھوئیں۔اور روغن لادن یا روغن گل اور اس کے سوا جو روغن بھی میسر آئے اس سے بالوں کو چرب کریں۔ بالوں کی رنگت اشقر (سرخی مائل زرد) کرنے کے لیے مہندی۔شراب اور راتینج گوندھ کر ان میں پھٹکری اور ہڑتال ملا کر ملیں۔ اشقر سرخی اور زردی کا درمیانی رنگ ہے۔ بالوں کو سرخ کرنے کے لیے ناگرموتھ اور کندش کے جوشاندہ سے دھوئیں۔ بالوں کے سفید کرنے کے لیے بنو ماش کو باریک پیس کر سرکہ ملا کر ضماد کریں۔

امراضِ ناخن

برص الاظفار۔ ناخنوں کا سفید ہو جانا

میتھی اور السی کو کوٹ کر شہد میں ملا کر ضماد کریں۔اگر فائدہ نہ ہو تو تنقیہ کریں۔

صفرۃ الاظفار۔ناخنون کا زرد ہوجانا

تخم جرجیر سرکہ میں پیس کر طلا کریں اور صفراء کو بدن سے کم کریں۔

وجع الاظفار۔ناخنوں کا درد

برگ مورد، برگ سروکوٹ کر ضماد کریں۔

تعقف الاظفار۔ناخنون کا ٹیڑھا ہوجانا

یہ وہ مرض ہے جس میں ناخنوں کی جڑ میں غلظت پیدا ہوجاتی ہے۔اس کو ''جذام الاظفار''یعنی ناخنوں کا کوڑھ بھی کہتے ہیں۔

علاج:۔سوداء کا تنقیہ کریں اور مرہم داخلیون اور دیگر قیروطیات لگائیں۔

تشقق الاظفار۔ناخنوں کا پھٹنا

اگر ناخن لمبائی میں پھٹے تو اس کا نام اسنان الاظفار(ناخنوں کے دانت) کہتے ہیں۔

علاج:۔سوداء کا تنقیہ کریں اور بدن میں تری پہنچائیں۔بط کی چربی مرغ کی چربی۔اور میتھی کا لعاب لگائیں۔

تقلع الاظفار۔ناخنوں کا اکھڑ جانا

(1)اس کا سبب اگر استرخاء ہو تو بے درد ہوگا۔علاج یہ ہے کہ بلغم کا تنقیہ کریں۔(2)اگر اس کا سبب خون کی حدت ہو تو اس میں درد ہوگا۔

علاج:۔رگ صافن کی فصد اور پنڈلیوں کی حجامت کریں۔اگر مرض ہاتھ کے ناخنوں میں ہو تو باسلیق کی فصد کھولیں اور جب کہ مرض پیر کے ناخنوں میں ہو تو شربت عناب سے خون کی تسکین کریں۔

انتفاخ وحکۃ الاظفار

یعنی ناخنوں کا پھولنا اور ان کی خارش۔اس کا علاج یہ ہے کہ دریا کے پانی سے دھوئیں اور انجیر کوٹ کر ضماد کریں۔

رَشّ الاظفار۔ناخن کا چھل جانا

ابتدا میں درد کی تسکین کے لیے برگ آس اور برگ انار کوٹ کر ضماد کریں۔اس کے بعد گیہوں کا آٹا اور روغن زیتون لگائیں۔

ظُفرہ طلقیہ

یہ وہ مرض ہے کہ ناخن ابرک (طلق) کے مانند سفید اور چمکدار ہوجاتا ہے اور بہت جلد ٹوٹ جاتا ہے۔

علاج:۔ ماء الاصول۔گلقند اور سکنجبین۔ روغن بادام کے ہمراہ دیں۔نضج مادہ کے بعد مطبوخ افتیمون پلائیں۔اور زوفائے رطب۔ بادام شیریں اور بکری کی چربی لگائیں۔

ناخون کے نیچے خون کا مردہ ہوجانا

علاج:۔آرد گندم اور زفت لگائیں اور شراب مثلث سے اکثر اوقات دھوئیں۔کبھی کبھی تخم جرجیر اور سرکہ طلا کریں۔اور دن میں چند مرتبہ انگلی منہ میں ڈال کر چوسیں۔نہایت مفید ہے۔

ناخن کا اکھیڑنا

اگر ناخن کو کسی سبب سے اکھیڑنا چاہیں تو ہڑتال۔جاؤشیر اور روغن بادام تلخ ضماد کریں۔لیکن اگر ضماد کرنے سے پیشتر مرہم داخلیون لگایا جائے تو بہت جلد اثر کرتا ہے۔

(میزان الطب(اردو) حکیم محمد اکبر،تیسری طباعت2011،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی)

مراسلہ

بلاشبہ قومی اردو کونسل دہلی نے "فروغ اردو زبان وتہذیب" کے فروغ کی خاطر ماہنامہ اردو دنیا، ماہنامہ خواتین دنیا، ماہنامہ بچوں کی دنیا اور سہ ماہی فکر و تحقیق شائع کر کے ایک تاریخ رقم کی ہے۔

بالخصوص خواتین دنیا اپنے اجرا کے بعد کئی سالوں تک اپنے نام کا ترجمان رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ سالوں میں خواتین دنیا کے اندر جو مضامین (نگارشات) شامل تھے ان میں کچھ حد تک جونیئر ہائی اسکول تا یونیورسیٹی کی طالبات کی پسند اور ضرورت ملحوظ خاطر تھیں۔

ضرورت ہے کہ از سر نو جہان نسواں کے پیش نظر جہاں ادبی نگارشات ہر شمارے میں شامل ہوں وہاں کم از کم ایک ایک مضمون بعنوان دستر خوان، صحت، آرائش و زیبائش، سلائی، کڑھائی و بنائی، بچوں کی حسن تربیت اور بڑوں کی مائیں ضرور شامل کیے جائیں تاکہ نئی نسل کی بیٹیاں کل کو کسی کی بیوی، ماں اور ساس بنے گی اور اپنی فرض منصبی سے صحت منداور خوشگوار معاشرہ کی تشکیل کرنے والی ہوں گی۔

میں پر امید ہوں کہ میری چند معروضات پر مفاد عامہ کی خاطر عملی اقدام اٹھائے جائیں گے۔ جو وقت کا ایک اہم تقاضہ ہے۔

روشن صدیقی، ناصر لائبریری. گورکھپور (یوپی)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہمایوں نامہ

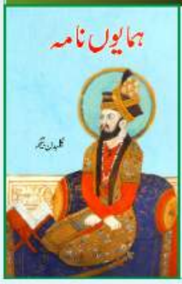

مصنف: گلبدن بیگم

چھٹی اشاعت: 2021

صفحات: 92

قیمت 55 روپے

دامان مریم

مصنف: محمد حسن، تحقیق و ترتیب: جمیل اختر

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 192

قیمت: 160 روپے

اردو-ہندی لغت

ایڈیٹر: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ

کوآرڈینیٹر: مسرت جہاں

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 416، قیمت: 125 روپے

اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

مصنف: حنیف کیفی

چوتھی اشاعت: 2021

صفحات: 580

قیمت 270 روپے

کلیات امور طبیعیہ

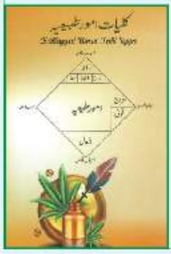

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 288

قیمت: 145 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

اچھی صحت کا راز

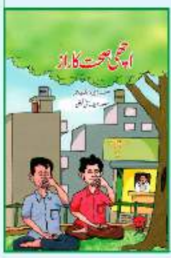

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in